SIECT
Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad
ISSN: 2581-9216

June 2022 جون

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

www.shibliinternational.com

قیمت: -/20 روپے

ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

Monthly Hyderabad

SADA E SHIBLI

جون June 2022 جلد: Vol:5 شمارہ: Issue:52

مدیر:

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران:

ڈاکٹر عبدالقدوس

ڈاکٹر سراج احمد انصاری

ابوہریرہ یوسفی

قیمت فی شمارہ:	20/-
سالانہ:	220/-
رجسٹرڈ ڈاک:	350/-
بیرونی ممالک:	50/- امریکی ڈالر
خصوصی تعاون:	2000/-

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی - پروفیسر مظفر علی شہہ میری

پروفیسر محسن عثمانی ندوی - پروفیسر ابوالکلام

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی - ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی

مفتی محمد فاروق قاسمی - مولانا ارشاد الحق مدنی

مولانا محمد مساعد ہلال احیائی

اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ - محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق - ڈاکٹر حمران احمد - ڈاکٹر ناظم علی

ڈاکٹر مختار احمد فردین - ڈاکٹر غوثیہ بانو

ڈاکٹر سید امام حبیب قادری - ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی

ڈاکٹر سمیہ تمکین - ڈاکٹر صالحہ صدیقی

ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ - ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

ڈاکٹر آصف لئیق ندوی - ڈاکٹر مظفر علی ساجد -

مولانا عبدالوحید ندوی - مولانا احمد نورعینی

ابوہریرہ ایوبی - محسن خان

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط وکتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352,
B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Dabirpura Road, Purani Haveli,
Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	نبی آخرالزماں محمد مصطفیٰ ﷺ	صفوۃ الرحمٰن صابر	۷
۴	منطقی وقدرتی غلبہ اور کامیابی دین اسلام کی طبیعت میں رکھی ہوئی ہے	مولانا ڈاکٹر ابوزاہد شاہ	۱۰
۵	اقوام متحدہ اور تحفظ انسانیت: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	۱۳
۶	نعت رسولؐ	خلیج جلیل نظامی	۱۷
۷	ذات پات کا شعور۔۔۔ بھارتی سماج کا ناسور	احمد نورعینی	۱۸
۸	غزل	کشور سلطانہ	۲۲
۹	اتر پردیش کے گلشن ادب کو وبائے کرونا میں الوداع کہنے والی شخصیات	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۲۳
۱۰	مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تہذیبی وثقافتی پہلو	محمد محامد ہلال	۲۸
۱۱	غزل	شاہنواز ہاشمی	۳۲
۱۲	غزل	قمر صدیقی	۳۲
۱۳	لفظ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں!!	سیدہ تبسم منظور	۳۳
۱۴	"تلک الایام"۔۔۔۔۔ ماضی، حال اور مستقبل کی بازگشت	سی فوزیہ	۳۵
۱۵	مزاحیہ نظم	خواہ مخواہ حیدرآبادی	۳۷
۱۶	بزم سخن اور ''گلدستۂ بزم سخن'' ایک تعارف	مبصر: اسامہ ارشاد معروفی	۳۸
۱۷	اقرارِ بشر	یاسین ہابیل	۴۰

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب ابوسفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی جنابمحمد یوسف بن الحاج محمد منیرالدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد

مفتی محمد فاروق قاسمی۔صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھراپردیش

ڈاکٹر سید جلیل حسین ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد

مولانا منصور احمد قاسمی، معین آباد، تلنگانہ

الحاج رئیس احمد اقبال، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد

الحاج محمد زکریا انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ) مقیم حال دبئی

ڈاکٹر شہباز احمد، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد

مولانا محمد عبدالقادر سعود نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد

الحاج محمد قمرالدین، نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

الحاج محمد عبدالکریم۔صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

اپنی بات

ماہِ جون ۲۰۲۲ء کا اداریہ لکھنے کے لیے بیٹھا ہوں تو میرے ذہن میں دو یعنی گستاخ رسول اور گیان واپی مسجد بنارس موجودہ غیر ضروری فتنہ ورشر سے پرانگیز واقعات گردش کر رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے ملک کے حالات گردش میں ہیں۔ حالیہ حکومت میں آئے دن کچھ لوگ میڈیا میں دشنام درازی کرتے ہوئے شہرت و دولت پانے کے لیے پڑھے لکھے جاہل نظر آتے ہیں، پہلے پہل وہ اقلیت طبقہ پر حملہ کرتے ہیں اس کے بعد ذات پر وار کرتے ہیں، پھر اس کے بعد اسلام اور اس ہستی پر گستاخی کرتے ہیں کہ جس نے دنیا میں بسنے والوں انسانوں کی اپنے کمالات واحسانات سے کایا پلٹ دی، دنیا کی تاریخ میں سو عظیم ہستیوں کا انتخاب کیا گیا تو اس میں امام الانبیاء، خاتم الانبیاء، افضل الانبیاء کا نام نامی اول نمبر پر آیا۔ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ ۔ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو گالی دے تو ہمیں پلٹ کر گالی دینے کا حکم نہیں ہے، مگر کوئی ہمارے نبی کی شان میں گستاخی کرے تو دنیا میں تمام بسنے والے مسلمان کا خون کھول اٹھتا ہے اور اس پر ہر مسلمان اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بی جے پی جماعت کے دو ترجمانوں نے نبی کریمؐ کی شان میں جو گستاخی کی ہے ہندوستان اور پوری دنیا کا ہر مسلمان دکھی ہے حکومت نے دیر آید درست آید کے تحت ان دونوں کو پارٹی اور عہدہ سے معطل کر دیا ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے کیونکہ اس کا علاج ان کے گناہوں کی سزا ملنا ہے۔ ان پر فتنہ پھیلانے، بغاوت، فساد برپا کرنے کا مقدمہ چلانا چاہئے کیونکہ انہیں کی گستاخی کی وجہ سے کان پور وغیرہ میں احتجاجی فساد پھوٹ پڑا ہے، جس کی وجہ سے جان و مال اور ذہنی کافی نقصان ہوا اور پوری دنیا میں ہمارے ملک کی بدنامی ہوئی۔ خبروں کے مطابق بعض خلیجی ممالک میں ہمارے ملک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا جا رہا ہے اور ٹوئیٹر پر ٹرینڈ چل رہا ہے۔ ادارہ موجود حکومت سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ مجرمین کو سخت سے سخت سزا دے تا کہ پھر دوسروں کو ہمت نہ ہو اور ملک سے پوری دنیا میں مثبت پیغام پہنچے۔

بابری مسجد کا زخم ابھی مندمل نہیں ہوا تھا کہ یہ مسئلہ چھڑ گیا کہ گیان واپی مسجد بنارس مندر توڑ کر بنائی گئی ہے شور مچاتے مچاتے پانچ خواتین نے کورٹ میں عرضی داخل کر دی کہ ہمیں گیان واپی مسجد دے دی جائے تا کہ ہم اسے مندر بنائیں حالانکہ ۱۹۹۱ء ایکٹ کے تحت یہ قانون بنا ہوا ہے کہ جو بھی مذہبی مقامات ہیں انہیں اسی حالت میں رکھا جائے گا اس میں دعویٰ کرنے کا بھی کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا، مگر کورٹ نے عرضی کو قبول کر لیا اور آنا فانا گیان واپی مسجد کا سروے کرنے کا حکم دے دیا۔ سروے کی ویڈیو کو دیکھ کر شر پسند عناصر مندر کی علامت بتا رہے ہیں جب کہ مسلمان یہ کہہ رہا ہے کہ مسجد کا حوض ہے جس سے ہم لوگ وضو بناتے ہیں اور بیچ میں نصب کردہ چیز فوارہ ہے۔ میڈیا میں گرما گرم بحث جاری آنے والا وقت بتائے گا کہ کورٹ اور حکومت کیا فیصلہ کرتی ہے لیکن اتنی بات تو طے ہے کہ مسلمان ذہنی طور پر پریشان ہے۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ اور مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم شاہین نگر حیدر آباد کا تعمیری کام جاری ہے۔ ادارہ قارئین سے مؤدبانہ گزارش کرتا ہے کہ تعمیری کام میں حصہ لے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں نوازش ہوگی

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی کو اپنے دست خاص سے قتل نہیں کیا، ابی بن خلف آپؐ کا سخت دشمن تھا، بدر میں فدیہ دے کر رہا ہوا تو ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا کہ ”میرے پاس ایک گھوڑا ہے ،جس کو میں ہر روز جوار کھلایا کرتا ہوں، اسی پر چڑھ کر محمد ﷺ کو قتل کروں گا۔“ احد میں اسی گھوڑے کو اڑاتا ہوا اور صفوں کو چیرتا ہوا آپؐ کے پاس پہنچ گیا، مسلمانوں نے چاہا کہ اس کو بیچ میں روک لیں، آپؐ نے منع فرمایا اور ایک مسلمان کے ہاتھ سے نیزہ لے کر آپؐ اس کی طرف بڑھے اور آہستہ سے اس کی گردن میں چبھودی، وہ چنگھاڑ مار کر بھاگا، لوگوں نے کہا یہ تو کوئی بڑا زخم نہیں ،تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ اس نے کہا ہاں سچ ہے لیکن یہ محمدؐ کے ہاتھ کا زخم ہے۔

راست گفتاری: (راست گفتاری پیغمبر کی ایک ضروری صفت ہے اور اس کا وجود ان کی ذات سے کبھی منفک نہیں ہوسکتا، اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے عنوان میں اس جزئیات کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی لیکن اس موقع پر ہم صرف ان شہادتوں کو قلم بند کرنا چاہتے ہیں جو دشمنوں کے اعتراف سے ہاتھ آسکی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو کفار میں جو لوگ آپؐ سے واقف تھے، انھوں نے آپ کو کاذب اور دروغ گو یقین نہیں کیا بلکہ یہ سمجھا کہ نعوذ باللہ آپؐ کے حواس درست نہیں ہیں، یا اب عقل بجا نہیں رہی ہے، یا یہ کہ ان میں اب شاعرانہ تخیل پرستی آ گئی ہے، اسی بنا پر انھوں نے آپ کو مجنون کہا ،مسحور کہا، شاعر کہا، لیکن کاذب نہیں کہا۔

ایک روز قریش کے بڑے بڑے رؤسا جلسہ جمائے بیٹھے تھے اور آپ کا ذکر ہو رہا تھا، نضر بن حارث نے جو قریش میں سب سے زیادہ جہاں دیدہ تھا، کہا اے قریش! تم پر جو مصیبت آئی ہے، اب تک تم اس کی کوئی تدبیر نہ نکال سکے، محمد تمہارے سامنے بچہ سے جوان ہوا، وہ تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ، صادق القول اور امین تھا، اب جب اس کے بالوں میں سپیدی آچلی اور تمہارے سامنے یہ باتیں پیش کیں تو کہتے ہو کہ وہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے، خدا کی قسم میں نے ان کی باتیں سنی ہیں، محمد میں یہ کوئی بات نہیں، تم پر یہ کوئی مصیبت ہی نئی آئی ہے۔

ابو جہل کہا کرتا تھا ”محمد! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا، البتہ جو کچھ کہتے ہو، ان کو صحیح نہیں سمجھتا“ قرآن مجید کی آیت اسی موقع پر نازل ہوئی:

قَدْ نَعْلَمُ اَنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (انعام ۶:۳۳)

ہم جانتے ہیں کہ اے پیغمبر ان کافروں کی باتیں تم کو غمگین کرتی ہیں، کیوں کہ وہ تجھ کو جھٹلاتے نہیں، البتہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

جب آنحضرت ﷺ کو پیش گاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ اپنے اہل خاندان کو اسلام کی دعوت دو، تو آپؐ نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکارا یا معشر قریش! جب سب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا ”اگر میں کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے، تو تم کو یقین آئے گا؟ سب نے کہا ہاں، کیوں کہ ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔“

(سیرۃ النبیؐ، جلد: دوم، ص: ۲۷۴/۲۷۶)

مولوی صفوۃ الرحمن صابر۔ حیدرآباد

نبی آخرالزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

اس وقت مکہ اور اطرافِ مکہ تمام دنیا میں جہالت وبربریت کا دور دورہ تھا۔ دین کی الٰہی تعلیم بھلادی گئی تھی اور دین کے نام پر ہر قسم کی گمراہی اور بداعمالیاں رائج تھیں۔ افکار واعمال کی خرابیوں کا لب لباب یہ ہے کہ انسان اپنی فطری حیثیت بندگی رب کو بھول گیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کو بھی الٰہ قرار دے رکھا تھا۔ مصیبتوں اور پریشانیوں میں مدد کے لیے ان ہی کو پکارتا تھا اور اپنے انجامِ آخرت سے بے خبر ہوگیا تھا۔ اس حقیقت کو تقریباً تمام انسان فراموش کرچکے تھے کہ "اصل وابدی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے، آخرت ہی کا نفع اصلی نفع ہے اور آخرت کا نقصان ہی اصلی نقصان ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا انجام ابدی سوز وتپش کی زندگی "الجحیم" اور اطاعت وفرماں برداری کا انجام ابدی عیش وراحت کی زندگی "الجنۃ" ہے غرض سارے انسان نقصانِ آخرت سے بالکل بے خوف ہوگئے تھے۔ "بَلْ لَّا یَخَافُوْنَ الْاٰخِرَۃَ" (المدثر:۵۳) بلکہ انجام آخرت سے بے خوف ہوگئے تھے۔ دنیا ہی ان کو مقصود ومطلوب تھی اور اخروی زندگی بالکل نظرانداز کردی گئی تھی۔ "بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ" (۲۰) "وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ" (۲۱:القیامۃ) بلکہ دنیا سے محبت رکھتے تھے اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے تھے) اس بنیادی خرابی کا نتیجہ یہ تھا کہ خون خرابہ، فتنہ وفساد، فواحش وبے حیائی۔ ہوس کی اتباع ان کی زندگی کے جلی عنوانات تھے۔ (یہ نقشہ قدیم دنیا ہی کا نہیں تھا بلکہ آج جدید دنیا بھی ان ہی امراض قلبی میں مبتلا ہے۔ جدید وقدیم کا فرق بے صبری وکم نظری کی دلیل ہے) الغرض ان تمام خرابیوں کا یہی ایک قدرتی علاج ہے کہ ان اللہ فراموش انسانوں کو سمجھایا جائے کہ اللہ جل شانہٗ جو تمہارے اور تمام کائنات کے خالق ورب ہیں۔ وہی تمہارے "الٰہ واحد" ہیں یعنی اللہ ہی کارساز وکارفرما ہیں۔ تم ان کے بندے ہو، ان کے فقیر ہو۔ تم اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا ملجا وماوی اللہ تعالیٰ ہی کو قرار دو۔ مصیبتوں اور پریشانیوں میں مدد کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہ پکارو۔ اور یہ کہ تم اپنی اصلاح وفلاح میں اللہ تعالیٰ کے علم وہدایت کے محتاج ہو۔ دنیا وآخرت کی بھلائی اسی میں ہے کہ تم اللہ جل شانہ کی ہدایتوں کے مطابق یہ سفر حیات طے کرو۔ ذوق شوق سے اللہ تعالیٰ کی بندگی واطاعت اختیار کرو تو پھر تمہارا ابدی ٹھکانا، آخرت کی خیر واقعی زندگی "الجنۃ" ہوگا اور اگر اس کے سوا کوئی اور طریقہ زندگی اختیار کروگے، تو یاد رکھو کہ خسرانِ آخرت ابدی ٹھکانا "النار" یقینی ہے۔

انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے نقصان ہی کے خوف سے اصلاح کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے خالقِ فطرت کی ہدایت یہی ہے کہ نقصانِ آخرت جو ابدی اور حقیقی نقصان ہے اس کا خوف دلا کر بندوں کو بندگی رب کی طرف بلایا جائے "وَاَنْذِرْھُمْ یَوْمَ الْحَسْرَۃِ اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ، وَھُمْ فِیْ غَفْلَۃٍ وَّھُمْ لَایُؤْمِنُوْنَ" (سورہ مریم:۳۹) اور ان کو حسرت کے دن سے ڈرایئے جبکہ ان کے تمام اعمال کا

فیصلہ کیا جائے گا (جس سے) وہ غفلت میں ہیں اور (جس پر) ان کو یقین نہیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ عام کے حکم کی تعمیل میں کوہ صفا پر چڑھ کر قبائل قریش کو جمع کیا اور سب کو مخاطب کر کے فرمایا۔ مجھے بتاؤ کہ تم مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا جانتے ہو۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا ہم نے کبھی کوئی غلط یا بے ہودہ بات تمہارے منہ سے نہیں سنی۔ ہم کو یقین ہے کہ تم صادق اور امین ہو۔ آپؐ نے فرمایا دیکھو میں پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں اور تم اس کے نیچے ہو۔ پہاڑ کے دونوں جانب میری نظر ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ دشمنوں کی ایک فوج تم پر حملہ کرنے کے لیے آرہی ہے تو کیا تم یقین کر لو گے۔ سب لوگوں نے کہا تم جیسے راست گو آدمی کو جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ جواب سن کر آپؐ نے فرمایا۔ تم کو سمجھانے کے لیے یہ ایک مثال تھی۔ اب یقین کرو کہ موت تمہارے سر پر آرہی ہے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ہونا ہے۔ میں عالم آخرت کو بھی اس طرح دیکھ رہا ہوں جس طرح تم دنیا کو دیکھ رہے ہو تم کو وہاں کے عذابِ شدید سے ڈراتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب یہ حکم نازل ہوا۔

اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (الشعراء:۲۱۴) ڈراؤ اپنے قرابت داروں کو۔ تو آپؐ نے قریش کو جمع کیا اور ہر قبیلہ کا نام لے کر متنبہ فرمایا "یابنی کعب بن لوئی انقذ وانسفکم من النار۔ یا بنی مرۃ بن کعب انقذوانفسکم من النار۔ یا بنی ھاشم انقذ وانفسکم من النار۔ اے اولادِ کعب بچاؤ اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے۔ اے اولادِ مرۃ بچاؤ اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے۔ اے اولادِ ہاشم بچاؤ اپنے آپ کو آگ سے۔ اسی طرح اپنے چچاؤں، چچازاد بھائیوں اور اپنی پھوپھی صفیہ اور صاحبزادیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ میں تم کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ عام طور سے آپ کا طریقہ دعوت یہی تھا کہ آپ جنت کی بشارت سنا کر ایمان لانے کی ترغیب دلاتے اور انکارِ حق کی ابدی جزاء عذابِ نار سے ڈراتے۔ اللہ جل شانہ نے آپ کو اسی طریقہ دعوت کی تعلیم دی تھی۔ چنانچہ قرآن کا بنیادی مقصد "وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ" (الانعام:۱۹) اور میری طرف قرآن کو وحی کیا گیا تاکہ میں تم کو ڈراؤں اور جس تک یہ پہنچے (وہ بھی یہ کام کرے)۔ یعنی امت مسلمہ کا بھی اہم ترین فرض یہی ہے۔ سورہ مریم میں ارشاد ہے۔ "فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِہِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِہٖ قَوْمًا لُّدًّا" (۹۷)۔ پس ہم نے قرآن کریم کو آپ کی زبان میں اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ اس سے متقیوں کو (جنت) کی خوشخبری سنائیں اور جھگڑالو انسانوں کو دوزخ سے ڈرائیں۔ سورہ الشوریٰ میں ہے۔ "وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَھَا وَتُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ لَارَیْبَ فِیْہِ. فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ" (۷) (اور ہم نے اسی طرح آپؐ پر قرآن عربی وحی کے ذریعہ نازل کیا تھا تاکہ آپ مکہ کے باشندوں (جہاں تک آپ سے ہو سکے ان) کو اور اس کے اطراف کے باشندوں کو ڈرائیں اور جمع ہونے کے دن (یوم حساب سے) ڈرائیں، جس کے واقع ہونے میں کوئی شب وشبہ نہیں ہے۔ اس روز ایک فریق جنت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں ہوگا) ان ہدایات ربانی کی تعمیل میں آپؐ نے لوگوں کو بندگی رب کی طرف بلایا۔ آپ لوگوں سے کہتے: من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ" جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے تمام معبودوں کا انکار کیا اور اللہ تعالیٰ کے الٰہ واحد ہونے کا اقرار کرتا رہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ قرآن مجید میں جتنی مکی سورتیں ہیں ان میں بیشتر انجام آخرت، حیاتِ بعد الموت کا بیان ہے۔ قیامت کا

اور اس کے اہم اہم جزء کا ذکر ہے روزِ حساب کا ذکر ہے .....جنت ونعمائے جنت کی وضاحت ۔دوزخ وعقوباتِ نار کی تفصیل ہے۔

اہل مکہ جونسلاً بعد نسل اس پندار میں مست تھے ملائکہ پرستی اور اجنّہ پرستی کی شکل میں اللہ پرستی کی جو تعلیم ان کے آباء واجداد نے دی ہے وہی تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ دنیا کی خوش حالی اس بات کی علامت ہے کہ اللہ ہم سے راضی ہیں۔ پس مرنے کے بعد بھی خوشحالی ہمیں ہی نصیب ہوگی اس لیے وہ قیامت' یوم حساب' سزا وجزائے اعمال کے قائل نہیں تھے۔ وہ نہ یہ برداشت کر سکتے تھے کہ دنیا وآخرت کا نفع ونقصان جن افرادِ خلق کے اختیار میں سمجھ رہے تھے ان کے نافع وضار ہونے کا انکار کیا جائے اور نہ یہ برداشت کر سکتے تھے جس عقیدہ وعمل کو وہ قربِ الٰہی ورضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھتے رہے ہیں اسے غلط کہا جائے۔ چنانچہ وہ دعوتِ الی اللہ کا پیام "لا الہ الا اللہ" سن کر بھڑک اٹھے اور آپ کو مجنون کہا۔ ساحر کہا۔ شاعر کہا۔ کیونکہ اپنے ہی جیسے ایک بشر کا رسول اللہ ہونا بھی ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ چنانچہ کہنے لگے وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْاَسْوَاقِ. لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا" (الفرقان:۷) اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسول کی شان معمولی آدمیوں کی طرح نہیں ہوسکتی' اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہ کر ڈراتا۔ بلکہ اللہ کے رسول کی شان یہ ہونی چاہئے کہ اس کی جلوہ میں فرشتے ہوں' اور اس کی رہائش وخورد ونوش کا غیبی سامان اس کے ساتھ ہو۔ چنانچہ کہتے۔ "اَوْيُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْتَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا" (الفرقان:۸) اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہ کر ڈراتا یا اس کے ساتھ غیب سے کوئی خزانہ کیوں نہیں آگیا یا کوئی باغ ہوتا جس سے یہ کھاتا پیتا) ان کو حیرت ہوئی کہ ان ہی میں کا ایک آدمی اللہ کا رسول کیسے ہوسکتا ہے۔ "اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ" (یونس:۲) کیا (مکہ کے) لوگوں کو تعجب ہوا' کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیجی۔

قریش کی یہی ذہنیت ان کے ایمان لانے میں مانع ومزاحم تھی۔ "وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا" (اسریٰ:۹۴) اور جب ان کے پاس ہدایت پہنچی تو ایمان لانے کے لیے اور کوئی بات مانع نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بشر کو رسولؐ بنا کر بھیجا ہے) اس لحاظ سے نبی کریمؐ کا بنیادی واوّلین کام یہی تھا کہ یہ تین حقائق اوّلاً ان کے ذہن نشین کرائیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی الٰہ واحد ہیں۔ ربوبیت والوہیت الٰہیہ میں افرادِ خلق ملائکہ وانبیاء علیہم السلام وغیرہم شریک نہیں۔ دوسرے یہ کہ محمدؐ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ تیسرے یہ کہ انسان کا آخری ٹھکانہ عالم آخرت ہے۔ جو جزائے اعمال کا عالم ہے۔ اور جزائے اعمال کا تعلق بالکلیہ انسان کے عقیدہ وعمل سے ہے۔ اس کی سعی ومحنت سے ہے۔ اگر اس کا عقیدہ وعمل تعلیم ربانی کے مطابق ہوگا تو اس کے لیے آخرت میں نفع ہی نفع ہے یعنی ایک ابدی عیش وراحت کی زندگی "الجنة" . ورنہ نقصان اور شدید نقصان' نہایت تکلیف دہ نقصان ہے۔ ایک ابدی سوز وتپش کی زندگی "الجحیم" اس لیے قیامت' یوم حساب اور جزائے اعمال کے ہر دو عالم "الجنة" و "النار" یقینی ہیں۔

مولانا ڈاکٹر ابوزاہد شاہ سید وحید اللہ حسینی القادری الملتانی۔ کامل الحدیث جامعہ نظامیہ (Osm)M.A., M.Com., Ph.D

منطقی وقدرتی غلبہ اور کامیابی دین اسلام کی طبیعت میں رکھی ہوئی ہے

تاریخ اسلام شاہد ہے جب بھی مال و دولت اور حکومت و اقتدار کے نشہ میں چور انسانوں نے مادی اسباب اور وسائل کا استعمال کرتے ہوئے متوازن، معتدل اور فطرت سلیمہ کے عین مطابق دین اسلام کو مٹانے کی سرتوڑ کوشش کی انہیں شکست کا ہی سامنا کرنا پڑا جبکہ نورِ اسلام ہمیشہ فروزاں اور اس کا پرچم پوری آب وتاب کے ساتھ لہراتا رہا ہے اور اسی طرح لہراتا رہے گا چونکہ اس کا وعدہ خود رب کائنات نے فرمایا ہے ترجمہ: ''(یہ لوگ) چاہتے ہیں کہ بجھادیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے اور انکار فرماتا ہے اللہ مگر یہ کہ کمال تک پہنچادے اپنے نور کو اگرچہ ناپسند کریں (اس کو) کافر۔ وہی (قادر مطلق) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو (کتاب) ہدایت اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کردے اسے تمام دینوں پر اگرچہ ناگوار گزرے (یہ غلبہ) مشرکوں کو'' (سورۃ التوبۃ آیات 32-33)۔ ابتدائے اسلام سے آج تک دین اسلام کے نور اسلام کو بجھانے کی بارہا کوشش کی جاچکی ہے لیکن اسلام کا نور درخشاں ہی رہا اور تاصبح قیامت رہے گا۔ لیکن جب مسلمان مومنانہ و داعیانہ کردار چھوڑ کر انسانیت کو مادی فوائد کے تابع کردیتا ہے اور اسلام کی تبلیغ کے بجائے اپنے مخصوص مکتب فکر کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے تو حالات یکسر بدل جاتے ہیں نتیجتاً مسلمانوں کی عزت و آبرو، جان و مال کے لیے شدید خطرات لاحق ہوجاتے ہیں۔ دین اسلام کی سربلندی کے لیے ضروری ہے کہ شمع توحید و رسالت کے پروانوں کو اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا پڑے گا۔ دعوائے ایمان کے باوجود اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خدا اور اس کے حبیبؐ کے احکامات اور فرامین کو فراموش کرنے، مختلف فرقوں میں بٹے رہنے، اپنوں کو مسلسل بیگانہ بنانے کی روش ہی کی نحوست ہے کہ آج وطن عزیز ہندوستان میں بھی اسلام کی نابودی اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی بھرپور کوششیں کی جارہی ہیں۔ ہندوستان میں اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے آئے دن دینی، تعلیمی، اقتصادی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی مسائل کھڑا کیے جارہے ہیں جس کی ماضی قریب میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ آج ہم ایسے ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں ایک طرف مہاپنیشد کا حوالہ دیکر یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ ساری انسانیت ایک خاندان کے مماثل ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کا اقتصادی مقاطعہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جہاں ایک طرف دستور و قانون اور عدل و انصاف کی بالادستی کے دعوے کیے جاتے ہیں تو دوسری طرف تمام تاریخی حقائق، دلائل اور شواہد کو بالائے طاق رکھ کر محض مذہبی جذبات اور آستھا کی بنیاد پر فیصلہ سنادیا جاتا ہے، جہاں ایک طرف حکومت سب کا ساتھ سب کا وکاس کا نعرہ دیتی ہے تو دوسری طرف اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو سیاسی طور پر اپاہج بنانے کی مکمل منصوبہ بندی کررہی ہے، جہاں ایک طرف معصوم اور بے قصور نوجوانوں پر ملک سے غداری کے مقدمہ

دائر کیے جارہے ہیں تو دوسری طرف دہشت گردی میں ملوث افراد کو ایوان پارلیمان و اسمبلیوں پہنچایا جارہا ہے، جہاں ایک طرف اسلام پر اعتراض کیا جارہا ہے کہ وہ تلوار کے زور پر پھیلا ہے جبکہ دوسری طرف گھر واپسی کا نعرہ دیکر مسلمانوں کو زبردستی مذہب تبدیل کرنے کے لیے مجبور کیا جارہا ہے، جہاں ایک طرف انسانی حقوق کی بات کرنے والی تنظیموں کو دہشت گرد تنظیم قرار دیا جارہے ہے تو دوسری طرف ہجومی تشدد کے ذریعہ لوگوں کو موت کی آغوش میں سلانے والی تنظیموں کے ارکان کو خانگی اور حکومتی سطح پر تہنیت پیش کی جارہی ہے، جہاں ایک طرف منادر کو منہدم کرنے والوں کو ظالم کہا جارہا ہے تو دوسری طرف مساجد (بالخصوص بابری مسجد) کو شہید کرنے والوں کو مجرم ماننے سے بھی گریز کیا جارہا ہے، جہاں ایک طرف زور وشور سے مساجد کو شہید کرنے کے مطالبے کیے جارہے ہیں تو دوسری طرف حکومت عوام کے پیسوں یعنی ٹیکس سے منادر کو مالی امداد دینے کے لیے بجٹ تیار کررہی ہے اور عوامی ٹیکس کے پیسوں سے ہی دیوالی کے موقع پر لاکھوں دیپ جلا کر پیسہ ضائع کررہی ہے جبکہ ہندوستان میں مہنگائی اور بے روزگاری عروج پر ہے جس کی آزاد ہندوستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی، جہاں ایک طرف عوامی مسائل اٹھانے اور حکومت سے سوال کرنے والے صحافیوں کو ملازمت سے برخواست کیا جارہا ہے تو دوسری طرف صحافت کے بنیادی اصولوں سے ناواقف لوگوں کو انعامات وایوارڈز سے نوازا جارہا ہے، جہاں ایک طرف اس شک پر کہ اسلامی مدارس میں دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے ان کو بند کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے تو دوسری طرف دھرم سنسد میں علی الاعلان ایک مخصوص طبقہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی اپیل کرنے والوں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جارہی ہے، جہاں ایک طرف مہذب لباس یعنی حجاب پہننے کو معیوب سمجھا جارہا ہے تو دوسری طرف جسم فروشی کو جائز قرار دیا جارہا ہے، جہاں ایک طرف سخت گیر ہندو نظریاتی موقف رکھنے والے لوگ تصور حلالہ کو سمجھے بغیر بے حیائی اور خواتین کے لیے ظلم قرار دے رہے ہیں تو دوسری طرف دانستہ طور پر ہندو خواتین (بالخصوص کنواری لڑکیوں اور اولاد سے محروم خواتین) کو اس شیولنگ (مرد کی شرم گاہ یعنی عضو تناسل) کی عبادت کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے جو پاروتی کی یونی (اندام نہانی) میں پیوست ہوتا ہے، علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان میں برہنہ سادھوؤں کا بھی بڑا احترام کیا جاتا ہے، کیا یہ بے حیائی، بداخلاقی اور ظلم نہیں ہے؟ جہاں ایک طرف گائے کے جائز گوشت کے استعمال پر سوالات اٹھائے جارہے ہیں تو دوسری طرف گائے کے ناپاک پیشاب کے فوائد گنوائے جارہے ہیں، جہاں ایک طرف جانوروں کے حقوق کے تحفظ کی بات شدومد کے ساتھ کی جارہی ہے تو دوسری طرف انسانی حقوق کی بات کرنے والی تنظیموں کو دھمکایا جارہا ہے اور انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے، جہاں ایک طرف جمعۃ الوداع اور عیدین کے موقع پر سڑکوں پر نماز ادا کرنے سے یہ کہہ کر روکا جارہا ہے کہ اس سے شہریوں کی آمد و رفت میں خلل واقع ہورہا ہے تو دوسری طرف رام نومی، ہنومان جینتی اور گنیش وسرجن وغیرہ جیسے تیوہاروں کے موقع پر سارا دن راستوں کو مسدود کردیا جاتا ہے، جہاں ایک طرف چند منٹوں کے لیے لاؤڈ اسپیکر پر دی جانے والی اذان کے خلاف آوازیں بلند ہورہی ہیں تو دوسری

طرف گھنٹوں لاؤڈ اسپیکر پر بھجن کے ریکارڈ بجائے جانے پر مکمل خاموشی چھائی رہتی ہے، جہاں ایک طرف ہندوستان میں آزادی کے 75 سال مکمل ہونے پر آزادی کا امرت مہا اتسو منایا جارہا ہے تو دوسری طرف انگریزوں کے ظلم وستم، جلیانوالہ باغ اور مجاہدین آزادی کو تختہ دار پر چڑھائے جانے والے حقائق کو امرت کی طرح پیکر صرف اور صرف اورنگ زیب اور دیگر مغل حکمرانوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے چونکہ وہ مسلمان تھے جبکہ ان میں بعض حکمراں ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے نہ صرف مندروں کے لیے جگہ فراہم کی بلکہ مالی امداد کے لیے فرامین بھی جاری کیے۔ جس طرح ناقص اشیاء استعمال کرکے پختہ عمارت کی تعمیر نہیں کی جاسکتی ہے اسی طرح ظلم وزیادتی اور غیر انسانی اقدار کے ساتھ صحت مند اور صالح معاشرہ کی تشکیل بھی ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ ہندوستان میں اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ روا رکھنے جانے والے سلوک کی روشنی میں یہ کہا جائے تو بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ امن وشانتی کا گہوارہ وطن عزیز ہندوستان اب آہستہ آہستہ متعصب ومتشدد ریاست میں تبدیل ہوتا جارہا ہے جو ملک کی سالمیت اور ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وطن عزیز ہندوستان میں تمام مجنونانہ حرکتیں محض اس لیے ہورہی ہیں تاکہ اسلام اور مسلمانوں کو دبایا جاسکے۔ باطل اور فرقہ پرست طاقتوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح کے حقیر منصوبوں، ریشہ دوانیوں، ہتھکنڈوں اور سازشوں سے نہ اسلام کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے ایمان کو کمزور و متزلزل کیا جاسکتا ہے۔ کسی نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ''پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ چونکہ قرآن، صاحب قرآنؐ اور دین اسلام کی حفاظت اللہ تعالی فرمارہا ہے۔ فرقہ پرست طاقتوں کو اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ مسلمان اس رب قدیر کی قدرت کاملہ پر ایمان ویقین رکھتا ہے جس نے نار نمرود کو گل وگلزار بنادیا تھا، جس نے مسور کے دانہ کے برابر سنگریزوں سے ابرہہ کے لشکر جرار کو تباہ و برباد کردیا تھا، جس نے جنگ بدر میں 313 صحابہ کرام کو لشکر جرار پر فتح عطا فرمائی تھی۔ تاریخ اسلام شاہد ہے جب بھی انسانی معاشرے میں فتنوں نے جنم لیا ہے تب مسلمان ان سنگین حالات سے خائف و مرعوب ہونے کے بجائے مالی و جانی قربانیاں پیش کرنے کے لیے تیار ہوا ہے اور اپنے ایمان کی حرارت و روشنی سے نہ صرف ان فتنوں کے خاتمہ کے لیے جد و جہد کی بلکہ معاشرے میں پھیلی ہوئی تاریکی کو روشنی سے متبدل کرنے کی اہم ذمہ داری بھی نبھائی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ وہ اسلام، مسلمانوں اور انسانیت کی بقا اور تحفظ کے لیے خواب غفلت سے جاگیں، فروعی اختلافات کو فراموش کریں، اجتماعی قوت واتحاد سے کام لیں اور مخلصانہ، بے باکانہ، جراتمندانہ، داعیانہ، قائدانہ کارنامے انجام دیں جو کردار میں تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ جب مسلمان مخالفین اسلام کے افکار و خیالات کو تبدیل کرنے کے بجائے اپنے کردار میں تبدیلی لائے گا تو مخالفت کی شدید آندھیاں خود بہ خود تھم جائیں گی، اللہ تعالی کا محولہ بالا وعدہ حرف بحرف پورا ہوگا اور باطل و فرقہ پرست طاقتوں کو بجز حسرت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی۔ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج تانڈور، ضلع وقار آباد، تلنگانہ

اقوام متحدہ اور تحفظ انسانیت: ایک تجزیاتی مطالعہ

بیسویں صدی کے دوسرے عشرہ میں یورپی ممالک برطانیہ اور جرمنی وغیرہ کے درمیان پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی، جس میں پوری دنیا بالواسطہ یا بلاواسطہ لپیٹ میں آگئی۔ جنگِ عظیم اوّل میں عالم اسلام کی نمائندہ حکومت ''خلافتِ عثمانیہ'' نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا اور جرمنی کے ساتھ وہ بھی شکست سے دوچار ہوئی، اور اس کے نتیجہ میں خلافت عثمانیہ ترکی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس جنگ میں تقریباً ۷۴/لاکھ انسانوں کے قتل ہوجانے کے بعد اقوام وممالک کے بین الاقوامی تنظیم ''لیگ آف نیشنز'' قائم کی گئی تھی، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اقوام وممالک کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کو جنگ کی صورت اختیار کرنے سے روکا جائے، لیکن یہ اپنے مقصد میں ناکام ہوگئی اور بیسوی صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کے درمیان پھر عالمی جنگِ برپا ہوئی، جس میں جرمنی اور جاپان ایک طرف اور برطانیہ، فرانس اور روس وغیرہ دوسری طرف تھے۔ اس جنگِ عظیم نے پہلی جنگِ عظیم سے زیادہ تباہی مچائی، اور اس کے آخری مرحلہ میں امریکہ نے اتحادیوں کی حمایت میں جنگ میں شریک ہوکر جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا، جس پر دوسری جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوا۔

جنگِ عظیم دوم میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے بہت نقصان اٹھایا تھا۔ جنگ کے بعد بڑے اتحادیوں کا ایک دوسرے سے الگ ہونے کا خطرہ منڈلا رہا تھا، جو امریکہ کے عالمی دباؤ (گلوبل پریشر) کے لیے اچھی علامت نہیں تھی۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ دنیا میں امن وامان قائم رکھنے کے بہانے ان بڑی طاقتوں کو ایک بین الاقوامی تنظیم کے ذریعہ آئندہ کامیابی کے لیے آپس میں رابطہ رکھنا ضروری ہے، انہوں نے سوچا کہ آپس میں تعاون دورانِ جنگ کامیاب رہا، اس لیے یہ تجربہ ان کو اقوام متحدہ کی کامیابی کے لیے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ''سان فرانسیسکو کانفرنس'' میں ان بڑی طاقتوں کے اپنے اپنے مفادات اور نظریات کو مفصل طور پر زیرِ بحث لانے موقع ملا اور ان بڑی طاقتوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی پوزیشن سے آگاہ کیا، بالآخر کچھ سمجھوتہ کے بعد ۲۴/اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ادارہ اقوام متحدہ (یونائیٹڈ نیشنس آرگنائزیشن (UNO) کا قیام عمل میں آیا، پھر ۱۰/دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے پریس کے مقام پر ایک قرارداد منظور کی، جس میں بنیادی انسانی حقوق کو نہایت باریک بینی اور چابک دستی سے تیس دفعات میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ بھی تاریخ کا ایک عجوبہ ہے کہ غارت گروں اور دنیا کے ایک بڑے حصہ کو تباہ وتاراج کرنے والوں کے ہاتھوں امن وسلامتی کے عنوان سے ایک عالمی اتحاد قائم کیا گیا جو کسی طور شک وشبہ سے عاری قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، نیز اس بات میں بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اس ادارہ کے بنانے اور اس کی منصوبہ بندی میں امریکہ بہادر کی سیاسی لیڈرشپ کا بہت بڑا اثر ورسوخ اور کردار رہا ہے، اور امریکہ نے دوسرے فریقین پر اثر انداز ہونے میں اپنی پوری توانائی صرف کی تھی، بقول اقبال ؎

یہ بت کدہ انہی غارت گروں کی ہے تعمیر
دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ

انسانی حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کا منشور اہلِ مغرب کے نزدیک ان کی ترقی، روشن خیالی، وقار اور حقوقِ انسانی کی پاسداری کی معراج ہے، مگر حقیقت میں یہ ایک حسین دستاویز، خوش نما دلاسا اور عمل سے عاری طفلِ تسلی والے الفاظ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

حقوقِ انسانی سے متعلق اقوام متحدہ کے متفقہ قرارداد میں تمام انسانوں کو اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی بات کہی گئی ہے۔ چنانچہ تیس دفعات پر مشتمل منشور میں مندرجہ ذیل دفعات خاص طور پر تحفظِ انسانیت سے تعلق رکھتے ہیں:

دفعہ نمبر:۳ ہر فرد کو زندہ رہنے، آزاد رہنے اور اپنی جان کی حفاظت کا حق حاصل ہے۔

دفعہ نمبر:۵ کسی بھی شخص کو تشدد، ظلم و ستم، غیر انسانی اور توہین آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

دفعہ نمبر:۹ کسی شخص کو بلا جواز گرفتاری، نظر بندی یا جلاوطنی کی سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ نمبر:۱۴ ہر فرد کو ظلم و تشدد سے بچنے کے لیے دوسرے ممالک میں پناہ لینے کا حق حاصل ہوگا۔ وغیرہ

اسی طرح دوسری دفعات میں بھی ہر فرد کو بلا امتیازِ رنگ و نسل، جنس، مذہب، زبان، سیاسی نظریات، سماجی حیثیت، مقام پیدائش یا اور کسی حیثیت سے امتیازی سلوک کے بغیر تمام حقوق اور آزادیوں کا مستحق قرار دیا گیا ہے، اور ہر طرح کی غلامی، محکومی، ناانصافی اور بندش سے آزاد باعزت و باوقار مساویانہ زندگی گزارنے کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔

ایک طرف اقوام متحدہ کا بہ ظاہر خوش نما اور دلوں کو موہ لینے والا دستاویز ہے جس سے متاثر ہو کر شروع میں پچاس ممالک نے اس پر دستخط ثبت کئے تھے اور اب تک ۱۹۳ ممالک اس منشور پر دستخط کر کے مجلس اقوامِ متحدہ کے ارکان میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس موقع پر کسی شاعر کا یہ شعر یاد آ رہا ہے:

چوں کہ لیبل نیک تھا، سب لوگ ساتھی ہو گئے
سوکھ کر ملت کے غم میں آپ ہاتھی ہو گئے

دوسری طرف تحفظِ انسانیت سے متعلق اقوام متحدہ کا کردار اور طرزِ عمل ہے، جو اپنے قیام کے زمانہ سے لے کر اب تک متنازعہ، مشکوک اور بڑی طاقتوں کا آلۂ کار رہا ہے، یہ ادارہ کمزوروں کے خلاف تو بہت فعال اور مستعد ہو جاتا ہے، مگر جب کسی بڑے ملک کے خلاف کاروائی کی ضرورت ہو تو وہ بین الاقوامی قانون کی وہ تعبیر قبول کرتا ہے جو طاقت ور ملک اپنے مفاد کے پیشِ نظر کرتا ہے، جیسے "ممکنہ جارحیت سے تحفظ کے حق" کے نام پر کسی چھوٹے ملک کے خلاف جارحیت کی اجازت دینا۔

اقوامِ متحدہ کے منشور میں ایک طرف مساوات اور ہر ایک کے ساتھ انصاف کی بات کہی گئی ہے، لیکن جمہوریت، آزادی اور اتفاقِ رائے کا دم بھرنے والے اور دیگر ممالک کو جمہوریت کا درس دانے والے پانچ بڑے ممالک (امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین) سلامتی کونسل میں ویٹو پاور کا استعمال کر کے اور اپنے مفاد کی خاطر دیگر ممالک کی سلامتی کو خطرہ میں ڈالتے ہوئے جمہوریت کا جنازہ اور آزادی و مساوات کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

منشور انسانی حقوق کے مطالعہ اور اس پر کئے گئے، تبصروں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر انسان کی اجتماعی کوششیں بھی اس کے لیے پروقار اور آبرومندانہ زندگی کی کوئی ضمانت مہیا نہیں کر سکیں، کمزور اور پس ماندہ طبقہ اپنے اپنے ملکوں

میں حکومتوں کے ظلم وجبر کے سامنے جتنا بے بس و بے اختیار پہلے تھا، اتنا آج بھی ہے، بلکہ حکومتوں کے دائرہ کار اور اختیارات میں مسلسل وسعت واضافے نے بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کو بالکل بے معنی بنادیا ہے، منشور انسانی حقوق کی حیثیت ایک حسین دستاویز سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس میں حقوق کی ایک فہرست تو مرتب کردی گئی ہے، لیکن ان میں سے کوئی حق بھی اپنے پیچھے قوتِ نافذہ نہیں رکھتا ہے۔ یہ نہ تو ریاستوں پر کوئی پابندی عائد کرکے انہیں بنیادی حقوق سلب کر لینے سے باز رکھنے کا کوئی اہتمام کرتا ہے اور نہ کسی فرد کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی کے لیے کسی قانون چارہ جوئی کا کوئی نظام فراہم کرتا ہے۔

اس طرح یہ منشور تحفظِ انسانی کے معاملہ میں بالکل ناکارہ اور ناقابلِ اعتماد دستاویز ہے، اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہے کہ اس نے انسانی حقوق کا ایک معیار قائم کردیا ہے اور عالمی انسانی برادری کو اپنے حقوق کے تحفظ کا ارتقائی احساس وشعور بخشا ہے، معاشرہ میں فرد کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اس کی مدد سے نوآزاد ممالک اپنے آئین وضع کرتے وقت بنیادی حقوق کے رسمی باب کو بسہولت مرتب کرسکتے ہیں۔ اس منشور کی حیثیت سراسر اخلاقی ہے، قانونی نقطۂ نظر سے بڑی طاقتوں کے درمیان اس کا کوئی وزن اور مقام نہیں ہے، البتہ کمزور ممالک پر شکنجہ کسنے کے لیے یہ منشور بڑی مستعدی دکھاتا ہے۔

بنیادی انسانی حقوق کے محافظ کی حیثیت سے اس منشور کی حیثیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف سیاسی قیدیوں کے معاملات سے متعلق بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International) کی شائع شدہ رپورٹ برائے سال ۷۶-۱۹۷۵ء کے مطابق اقوام متحدہ کے ۱۴۲ رکن ممالک میں سے ۱۱۳ ملکوں میں بنیادی انسانی حقوق کی سنگینی خلاف ورزیاں کی گئیں اور طاقت کا بے جا استعمال، بلاوجہ گرفتاریوں، سیاسی قید وبند، جبر وتشدد اور سزائے موت کے واقعات میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔

اگرچہ اس ادارہ کی جانب سے خدمتِ خلق کے کچھ ظاہری ونمائشی کام بھی ہوئے ہیں، جن سے انکار نہیں کیا سکتا ہے، جیسے: غذائی اجناس اور پینے کے صاف پانی کی فراہمی، تعلیم پر زور، صحت کے تعلق سے عوامی بیداری، مشکل حالات میں متعلقہ ملکوں کی مدد، تحفظِ اطفال، پناہ گزینوں کی فکر، بچوں کو ویکسین کی فراہمی اور خواتین کی زچگی کی صحت میں مدد وغیرہ، لیکن انسانی جانوں کی ہلاکت اور ان کے تحفظ میں کوتاہی کے مقابلہ میں یہ کام کوئی وزن نہیں رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ ادارہ بڑی طاقتوں کے ظلم وزیادتی، دھاندلی ومن مانی سے غریب ممالک کی عوام کو تحفظ دلانے میں بالکل ناکام ثابت ہوا ہے، نیز اقوامِ متحدہ کے امدادی کارکن اور امن فوجیوں کی طرف سے کئے جانے والے جنسی حملے بھی اس ادارہ کی بدنامی کی وجہ بنے ہیں، خاص طور پر ہیٹی، کانگو، نائیجیریا اور جنوبی سوڈان میں ابھی تک اقوام متحدہ کے مشن کے خلاف تحقیقات جاری ہیں۔

اقوام متحدہ کے قیام سے لے کر ۲۰۱۹ء تک ۲۵۰ر سے زائد مرتبہ سلامتی کونسل کے مستقل رکن ممالک کی جانب سے ویٹو کیا جاچکا ہے، روس نے اب تک سب سے زیادہ ایک سو دس مرتبہ ویٹو کیا ہے، خاص طور پر اس نے وسطی ایشیاء، مشرقی یورپ، شام اور یوکرائن کے حوالے سے ویٹو پاور کا استعمال ہے، جب کہ امریکہ نے اب تک سو کے قریب قراردادوں کو اپنے ویٹو کے ذریعہ مسترد کیا ہے، ان میں زیادہ تر اسرائیل کے خلاف اور فلسطین کے حق میں تھیں، اسی طرح

برطانیہ نے ۳۲ رفرانس ۱۶ راور چین نے ۱۳ رقراردادوں کو اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے ناکام بنایا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اقوامِ متحدہ ایک بین الاقوامی تنظیم ہے اور اس کے تحت متفقہ طور پر یا اکثریت کے ساتھ طے ہونے والے فیصلے ''بین الاقوامی معاہدات'' کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن یہ قطعاً صحیح نہیں ہے، اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اپنے جن فیصلوں کو دنیا پر نافذ کرنا چاہتی ہے وہ عملاً نافذ ہوتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والے کمزور ممالک کو سزا دی جاتی ہے، یہاں تک کہ ان پر فوج کشی بھی کی جاتی ہے، اور انہیں اقوام متحدہ کا فیصلہ تسلیم کرنے پر بزور مجبور کیا جاتا ہے۔ اس لیے انسانی حقوق کا چارٹر اور اقوام متحدہ کے دیگر فیصلے صرف معاہدات نہیں، بلکہ عملاً بین الاقوامی قانون بن چکے ہیں، اور اقوام متحدہ صرف بین الاقوامی تنظیم نہیں بلکہ عملاً ایک عالمی حکومت کا درجہ رکھتی ہے، جس کے ذریعہ سلامتی کونسل میں ویٹو پاور رکھنے والے پانچ ممالک عملاً پوری دنیا پر من مانی حکومت کر رہے ہیں۔

سینئر سفارت کاروں اور تجزیہ نگاروں کا احساس ہے کہ اقوام متحدہ کی تعمیر میں خرابی کی صورت آغاز ہی سے مضمر رہی ہے، جب تمام اقوام کو برابری کا درجہ دینے کا اصول، چند بڑی طاقتوں کو ویٹو کا اختیار دے کر ختم کر دیا گیا اور حقِ خود ارادیت کا سنہری اصول فلسطینیوں کی مرضی کے برعکس ان کی سرزمین پر اسرائیل کی مملکت زبردستی قائم کر کے ملیامیٹ کر دیا گیا۔

سویڈن میں اپسالا کانفلکٹ ڈیٹا پروگرام (UCDP) کے سیاسی تشدد کے بارے میں ۲۰۱۷ء تک کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۴۶ء کے بعد سے ۲۸۵ رمختلف تنازعات کی نشان دہی کی گئی ہے، اور ورلڈان ڈیٹا کے مطابق ۱۹۴۶ء کے بعد سے ہونے والی جنگوں میں چار ایسی جنگیں ہیں، جن میں بہت بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے ہیں: (۱) جزیرہ نما کوریا کی جنگ (۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۲ء) جس میں تقریباً بارہ لاکھ افراد ہلاک ہوئے (۲) ویتنام کی جنگ (۱۹۵۵ء تا ۱۹۷۵ء) جس میں تقریباً پندرہ لاکھ لوگ مارے گئے اور اکیس لاکھ کے قریب زخمی ہوئے (۳) ایران عراق کے درمیان طویل جنگ (۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۸ء) جس میں تقریباً پونے آٹھ لاکھ افراد ہلاک ہوئے (۴) اور افغانستان پر سوویت یونین کی مداخلت اور اس کے خلاف سی آئی اے کی خفیہ جنگ (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۹ء)۔

اسی طرح کمبوڈیا میں خمر روگ کے دور میں ہونے والی نسلی کشی میں ایک اندازے کے مطابق بیس لاکھ کے قریب افراد ہلاک ہوئے، باوجود اس کے کہ خمر روک بدترین قسم کی خانہ جنگی کی ذمہ داری تھی، اقوام متحدہ نے اس کی قانونی حیثیت کو جائز قرار دیا تھا۔

اکیسویں صدی میں افغانستان پر امریکی حملے، مشرقِ وسطیٰ خاص طور پر عراق پر امریکی فوج کشی اور افغانستان، عراق، شام، صومالیہ اور یمن میں خانہ جنگیاں اور چین کی ریاست سنکیانگ اور برما میں نسل کشی جن میں بڑی تعداد میں لوگ تباہ و برباد ہوئے، لیکن اقوام متحدہ نے ان لاکھوں انسانی جانوں کے تحفظ کے لیے کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہ دیا، نہ ہی اس نے جارح اور ظالم کو لگام دینے کی کوشش کی اور نہ ہی اس سے باز پرسی کی ہمت کی، جب کہ ان ممالک میں سے بعض میں اب بھی بشمول فلسطین شورش، نسل کشی، جارحیت اور خانہ جنگی کا سلسلہ جاری ہے، نیز یوکرائن کے معاملہ میں سرد جنگ، شمالی کوریا کی طرف سے مسلسل ایٹمی حملے کی دھمکیاں اور تباہ ہوتا ہوا مشرقِ

وسطیٰ جو مسلسل افراتفری میں ڈوبتا جا رہا ہے، جس کی وجہ سے اقوام متحدہ کو ہر طرف سے تنقید کا سامنا ہے اور اس کی تعریف کے بجائے اس پر تنقید میں اضافہ ہو رہا ہے، جس کے مطابق اقوام متحدہ امن کا محافظ نہیں، بلکہ ایسا مہنگا کلب ہے جہاں صرف بحث کی جاتی ہے اور لنگڑے فیصلے کئے جاتے ہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ نیویارک میں اقوام متحدہ کے پرتعیش دفاتر جنگوں اور بحرانوں کو حل کرنے سے ہزاروں میل دور ہیں۔

غرض اقوام متحدہ ایک ایسا ادارہ ہے جو مساوات کے نام پر عدمِ مساوات، جمہوریت کے نام پر ڈکٹیٹرشپ، آزادی کے نام پر غلامی، انصاف کے نام پر ناانصافی اور تحفظ کے نام پر عدمِ تحفظ کو قانونی شکل دینے والا ایک ''مہذب ادارہ'' ہے، جو چند بڑی طاقتوں کا آلۂ کار اور کمزور ممالک واقوام پر ظلم وستم کا تماشہ بیں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

اس لیے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ۷۷ رسال سے جاری اس شرم ناک اور اذیت ناک کھیل کو جلد سے جلد بند کیا جائے۔ یا تو اقوام متحدہ کی تشکیل جدید عمل میں لائی جائے اور اس پر پانچ ممالک کی اجارہ داری، بالادستی اور ویٹو پاور کو یکسر ختم کر کے جملہ تمام ۱۹۳ رممالک ارکان کو مساوی درجہ وحیثیت دی جائے، یا پھر مظلوم ممالک اقوامِ متحدہ سے ناطہ توڑ کر اپنا الگ وفاق واتحاد قائم کریں اور خلوص، عدل، انسانی اخوّت، توکل اور مضبوط قوّتِ ارادی کے ساتھ خود بھی ان کی غلامی اور استحصال سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں اور تمام انسانیت کو ظلم واستحصال سے باز رکھنے کے لیے ایک نیا عالمی اتحاد قائم کریں ۔

اٹھ کہ بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

شاعر خلیج **جلیل نظامی**۔ حیدرآباد دکن

نعت رسولؐ

ہونے سے ایک روضہء اطہر زمین پر
ہے آسمان ، شہر پیمبر زمین پر

خاک در رسول کو پلکوں سے چومنے
آتا ہے روز چرخ سے خاور زمین پر

پتھر دلوں کو موم بنایا حضورؐ نے
وحدت کے پھول اگا دیئے بنجر زمین پر

پاتے ہیں داد حضرت سدرہ نشین کی
نعت نبی سنا کے سخنور زمین پر

ہر دم ہے قدسیوں کی زباں پر درود پاک
"ہوتا ہے ذکر آپ کا گھر گھر زمین پر"

موجود جس زمین پہ ہیں ان کے نقش پا
قربان دو جہاں ہے اسی سر زمین پر

جب ساکنان عرش میں کوئی نہیں جلیلؔ
کیا ہوگا خاک آپ کا ہمسر زمین پر

احمد نور عینی۔ پی ایچ ڈی اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

ذات پات کا شعور۔۔۔ بھارتی سماج کا ناسور

ذات پات بھارتی سماج میں پائی جانے والی ایک ایسی لعنت ہے جس کی دنیا کے کسی بھی سماج میں کوئی نظیر نہیں ملتی، ذات پات کی بنیاد عدم مساوات پر ہے، اس میں یہ مانا جاتا ہے کہ سارے انسان برابر نہیں ہے؛ بل کہ سماج کے بعض طبقات بعض سے برتر اور بعض طبقات بعض سے بدتر ہیں، برتر اور بدتر ہونے کا معیار انسان کے اندر پائی جانے والی قابلیت یا صلاحیت نہیں؛ بل کہ مخصوص طبقہ یا مخصوص ذات میں پیدا ہونا ہے، اس نظام میں فضیلت یا رذالت طے کرنے کی کسوٹی پیدائش ہے، یعنی کوئی برہمن سماج کے دیگر ذات والوں سے اس لیے افضل ہے کہ وہ برہمن ذات میں پیدا ہوا اور کوئی شودر دویجہ سے اس لیے ارذل ہے کہ وہ شودر کی ذات میں پیدا ہوا، اسی طرح کوئی اتیج اس لیے ناپاک ہے کہ وہ اچھوت ذات میں پیدا ہوا، لہذا جو برہمن ہے وہ چاہے کتنا بھی گھٹیا کام کرلے وہ چوں کہ برہمن پیدا ہوا اس لیے وہ افضل ہی رہے گا اور جو شودر ہے وہ چاہے کتنا بھی قابل ہو جائیوہ چوں کہ شودر پیدا ہوا اس لیے وہ گھٹیا ہی رہے گا، اسی طرح جو اتیج ہے وہ چاہے جتنا بھی صاف ستھرا رہے وہ چوں کہ اتیج پیدا ہوا اس لیے وہ اچھوت اور ناپاک ہی رہے گا، یعنی اس نظام میں میرٹ اور قابلیت کا تعلق انسان کے عمل اور کردار سے نہیں ہے؛ بل کہ اونچی ذات میں پیدا ہونے سے ہے، جو جتنی اونچی ذات میں پیدا ہوگا وہ اتنا قابل سمجھا جائے گا، اور برہمن کی ذات چوں کہ سب سے اونچی ذات ہے اس لیےوہ سماج میں سب سے زیادہ قابل سمجھا جاتا ہے۔

ذات پات کے نظام میں سماج کو دسیوں ہزار ٹکڑیوں میں بانٹا گیا، تقسیم کے اس عمل کے پیچھے یوریشیا سے آکر بھارت پر حملہ کرنے والی اس قوم کا ہاتھ اور دماغ ہے جسے ”برہمن“ کہا جاتا ہے، یہ بات سائنسی تحقیقات سے ثابت ہوچکی ہے کہ برہمن، چھتری اور ویش جنھیں تاریخ میں آریہ کے لفظ سے ذکر کیا جاتا ہے زائد از چار ہزار سال قبل یوریشیا سے بھارت پر حملہ آور ہوئے، بھارت پر حملہ کرکے ان لوگوں نے یہاں کی قوموں کو نہ صرف یہ کہ محکوم بنایا بلکہ غلام بنایا، یہاں آنے کے بعد ان لوگوں نے سب سے پہلی تقسیم آریہ اور اناریہ کے نام پر کی، آریہ یعنی ودیشی حملہ آور قوم اور اناریہ یعنی بھارت کی مولنواسی قوم، سماج چلانے کا کام آریہ نے اپنے ہاتھ میں لیا؛ چناں چہ مذہبی پیشوائی کرنے اور ویدوں کی تعلیم دینے والا طبقہ برہمن کہلایا، حکومت کرنا اور سرحدوں کی حفاظت کرنا جس کے ذمہ آیا اسے چھتری کہا گیا اور مال جمع کرنے کی ذمہ داری جس کے حصہ میں آئی اسے ویش کا نام دیا گیا، دوسری طرف اناریہ کا کام صدق دل سے حاکم طبقہ (آریہ) کی خدمت کرنا طے پایا، اناریہ قوم کے ابتدا میں دو ٹکڑے ہوئے، ایک ٹکڑا برہمن کے ساتھ سماج (گاؤں) کے اندر ہی رہا اور دوسرا سماج چھوڑ کر آبادی سے باہر چلا گیا، جو لوگ طوعا یا کرہا برہمن کی غلامی پر راضی ہوگئے وہ سماج کے اندر ہی رہے اور جو لوگ اس پر راضی نہ ہوئے وہ سماج سے باہر چلے گئے یا بھگا دیے گئے، اول الذکر کو شودر اور ثانی الذکر کو اتی شودر کہا گیا، بھارت کے مولنواسیوں (اناریوں) کو شودر اور اتی شودر میں تقسیم کرنے کی

یہ ضرب ایسی کاری تھی کہ آج تک یہ دونوں ٹکڑے برہمن واد کے خلاف متحد نہ ہو پائے، برہمن سماج میں رہنے والا شودر طبقہ اچھوت سمجھا گیا اور سماج سے باہر جانے والا طبقہ اچھوت قرار دیا گیا، اس طبقہ کو برہمن اور ویشیہ نے تو اچھوت سمجھا ہی؛ حد تو یہ ہے کہ شودر نے بھی انھیں اچھوت سمجھا، شودر اور اتی شودر کے درمیان نفرت کی خلیج بڑھتی گئی اور برہمن کا ورچسو مستحکم سے مستحکم تر ہوتا رہا، سماج سے باہر آنے والا اتی شودر کا طبقہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہوا، ایک گاؤں کے باہر ہی آباد ہو گیا اور دوسرے نے جنگلوں اور پہاڑوں کا رخ کیا، اول الذکر کو شاستروں میں انتیج کہا گیا اور ثانی الذکر آدی واسی کے نام سے مشہور ہوا، یہ انتیج وہی طبقہ ہے جسے آج کل ایس سی یا دلت کہا جاتا ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں بسنے والا آدی واسی طبقہ برہمن اور ویشیہ کے نزدیک تو جنگلی اور وحشی تھا ہی، افسوس تو اس پر ہے کہ شودروں نے بھی اسے جنگلی اور وحشی سمجھا اور غضب تو یہ ہے کہ انتیجوں نے بھی اسے جنگلی اور وحشی گردانا اور غضب بالائے غضب تو یہ ہے کہ ویشیہ اور شودر کی طرح آدی واسی طبقہ نے بھی انتیج طبقہ کو اچھوت سمجھا، یوں اناریہ کے تین طبقات ہو گئے: شودر، انتیج اور آدی واسی، ان تینوں طبقات کے دل ایک دوسرے کے تئیں اس قدر میلے ہو گئے یا کر دیے گئے کہ آج بھی ان تینوں کے بیچ غیریت کی دیواریں حائل ہیں اور پسِ دیوار برہمنواد کا کھیل جاری ہے۔ برہمنوں نے طبقات کے اس نظام کے بعد ذات پات کا نظام مستحکم کیا، ملونواسی بھارتیوں (اناریوں) کو چھ ہزار سے زائد ذاتوں میں بانٹا اور پھر ان ذاتوں کو ستر ہزار سے زائد ذیلی ذاتوں میں منتشر کیا، یوں بھارتی ملونواسیوں (اناریوں) کی اکثریت تقسیم در تقسیم ہو کر ستر ہزار سے زائد ٹکڑیوں میں بٹ گئی اور ودیش سے آنے والا برہمن طبقہ اقلیت میں ہونے کے باوجود اس دیش پر راج کرتا رہا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے اور آریہ سماجی بھی اسی کی وکالت کرتے ہیں کہ ذاتوں کی یہ تقسیم ابتدا میں کرم (عمل) کی بنیاد پر تھی، بعد میں جنم کو بنیاد بنایا گیا، یعنی ابتدا میں ایسا نہیں تھا کہ برہمن کے گھر پیدا ہونے والا برہمن ہی ہو؛ بل کہ مذہبی پیشوائی کرنے کی جس میں قابلیت ہوتی اور اپنی قابلیت کی وجہ سے جو یہ عمل کرتا وہ برہمن کہلاتا، چاہے وہ شودر کا لڑکا کیوں نہ ہو؛ جب کہ یہ بات صحیح نہیں ہے، دھرم شاستر سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ چاتر ورنیہ کی یہ تقسیم جنم کی بنیاد پر ہے نہ کہ کرم کی بنیاد پر؛ چناں چہ آپستمبہ دھرم سوتر میں ہیکہ ذاتیں چار ہیں: برہمن، چھتری، ویش اور شودر، ان میں ہر ذات اپنے بعد والی ذات سے پیدائش کی بنیاد پر افضل ہے۔ (اپستمبا دھرم سوتر: 1:1:1:4، 5)۔ وید کے پروشا سوکت میں بھی جنم کی ہی بات آئی ہے۔ یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ آریہ اور اناریہ کی تقسیم جنم کی بنیاد پر ہے نہ کہ کرم کی بنیاد پر، یعنی کوئی شخص آریہ اس لیے ہے کہ اس نے آریہ قوم میں جنم لیا اور کوئی شخص اناریہ اس لیے ہے کہ اس نے بھارت کی ملونواسی قوموں میں جنم لیا، برہمن آریہ قوم سے ہے اور شودر اناریہ قوم سے، اس لیے شودر کا بیٹا برہمن یا برہمن کا بیٹا شودر نہیں ہو سکتا، یعنی شودر جنم کی بنیاد پر برہمن سے الگ ہے اور برہمن جنم کی بنیاد پر شودر سے الگ ہے؛ البتہ اس بات کا امکان ہے کہ آریہ کے تینوں طبقات: برہمن، چھتری، ویش ابتدا میں کرم کی بنیاد پر وجود میں آئے ہوں بعد میں جنم کو بنیاد بنا لیا گیا ہو، اسی طرح شودر اور اتی شودر کی ذاتوں اور ذیلی ذاتوں کی تقسیم ابتدا میں کرم کی بنیاد پر وجود میں آئی ہو بعد میں یہ تقسیم جنم سے مربوط ہو گئی ہو، اسی طرح اس بات کا بھی امکان ہے کہ اناریوں کے پیشوں کی

بنیاد پر ذات پات کو مستحکم کیا گیا ہو اور پھر ان پیشوں کو ذات سے مربوط کر دیا گیا ہو، خلاصہ یہ کہ آریہ اور انا ریہ کی اندرونی تقسیم میں تو اس بات کا امکان ہے کہ ان کا آغاز کرم کی بنیاد پر ہوا ہو؛ مگر یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آریہ (برہمن، چھتری، ویش) اور انا ریہ (شودر واتی شودر) کی بنیادی تقسیم بھی ابتداء کرم کی بنیاد پر ہوئی ہے، سائنسی تحقیقات سے بھی جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہی کہ جنم کی بنیاد پر برہمن چھتری، ویش الگ ہیں اور شودر واتی شودر (ایس سی، ایس ٹی، او بی سی) الگ ہیں؛ چناں چہ مائیکل بام شاد کے زیر قیادت ہونے والی ڈی این اے تحقیق کی 2001 میں منظر عام پر آنے والی رپورٹ کے مطابق اونچی ذاتوں (برہمن، چھتری، ویش) کا ڈی این اے بھارتی اقوام سے میل نہیں کھاتا، ڈی این اے کی بنیاد پر یہ لوگ بھارتی ہونے کی بجائے یوریشیائی ہیں، اس رپورٹ میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر برہمن، چھتری، ویش، شودر اور اتی شودر کی ذاتوں کی تقسیم ابتداء کرم کی بنیاد پر ہوتی تو سب کا ڈی این اے مخلوط رہتا، ڈی این اے کی یہ تقسیم اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ بھارت کی قدیم قومیں (انا ریہ) جنم کی بنیاد پر برہمن سے الگ ہیں، انفرادی استثنائات ہو سکتے ہیں؛ مگر بحیثیت مجموعی حقیقت یہی ہے کہ آریہ اور انا ریہ کی تقسیم جنم کی بنیاد پر ہے، یعنی برہمن، چھتری، ویش الگ قوم ہے جو یوریشیا سے آکر بھارت پر حملہ آور ہوئی اور شودر واتی شودر (ایس سی، ایس ٹی، بی سی/ او بی سی) الگ قوم ہے جو آریہ کے حملہ سے پہلے بھارت میں آباد تھی، اس لیے یہ لوگ اپنے آپ کو مولنواسی کہتے ہیں۔

آریہ اور انا ریہ کی اس تقسیم میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ذات پات اور طبقات کے اس نظام میں وہ ذاتیں اونچی اور افضل سمجھی گئیں جن کا تعلق ودیش سے آنے والی آریہ قوم سے ہے اور وہ ذاتیں نیچ اور گھٹیا سمجھی گئیں جن کا تعلق بھارت کی قدیم مولنواسی اقوام سے ہے، اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اونچ نیچ کی یہ نفسیات مرور ایام کے ساتھ اپنے آپ پیدا نہیں ہوئی؛ بل کہ اس کے پیچھے برہمن کا دماغ کارفرما ہے، برہمن کے دماغ کی کارستانی ہے کہ اس نے برہمن، چھتری، ویش کو دویجہ قرار دیا، دویجہ کا مطلب ہے دو مرتبہ جنم لینے والا، برہمنی لٹریچر کے مطابق ایک مخصوص عمر کو پہنچنے کے بعد جب جنیو باندھا جاتا ہے تو اس وقت جنیو باندھنے والے کا دوبارہ جنم ہوتا ہے، جنیو باندھنے کی اس رسم کو اپانیان کہا جاتا ہے، برہمن، چھتری، ویش انہی تینوں کو جنیو باندھنے کا حق ہے، یہ تینوں آریائی نسل کے ہیں، انا ریہ یعنی بھارت کی قدیم مولنواسی قوموں کو جنیو باندھنے کا حق نہیں ہے، اور چوں کہ جنیو باندھنے والے کو ہی تعلیم کا حق ہے اس لیے شودر واتی شودر کو برہمنی دھرم میں تعلیم کا حق حاصل نہیں ہے، گویا جنیو ایک ایسی علامت ہے جس سے اونچی ذاتیں (برہمن، چھتری، ویش) نیچ ذاتوں سے ممتاز ہوتی ہیں، مزید وضاحت کے ساتھ کہا جائے تو جنیو انسانوں کے درمیان نسلی امتیاز کی علامت ہے جب تک جنیو رہے گا افضلیت کا کیڑا جنیو دھاریوں کے دماغ سے نہیں نکلے گا، اس لیے جنیو پہننے والا چاہے کتنا ہی سماجی انصاف کی بات کر لے اسے زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ اور نہیں سمجھا جائے گا۔

آریہ اور انا ریہ کی اس تقسیم میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ چوں کہ انا ریہ (شودر واتی شودر) کا کام صدق دل سے اوپر کے ورنوں: برہمن، چھتری، ویش کی خدمت کرنا قرار پایا اس لیے ان لوگوں نے دست کاری، خدمت گاری اور صاف صفائی کے پیشے اپنائے، برہمن کے دماغ نے یہاں بھی

اونچ نیچ اور فضیلت وحقارت کا کھیل کھیلا، برہمن، چھتری، ویش کے پیشے معزز سمجھے گئے اور شودر واتی شودر کے پیشے گھٹیا گردانے گئے؛ چناں چہ دست کاری، خدمت گاری اور صاف صفائی کے پیشے گھٹیا اور حقیر قرار دیے گئے، اوران پیشوں سے منسوب نام بھی حقارت کی علامت بن گئے؛ بل کہ بعض نام تو گالی کے طور پر استعمال ہونے لگے، ان پیشوں کو حقیر قرار دینے کے پیچھے جو ذہنیت سمجھ میں آتی ہے وہ یہی کہ یہ پیشے ان ذاتوں نے اپنایا جنھیں برہمن نے غلام بنایا، اور نہ صرف غلام بنایا بل کہ ان ذاتوں کو نیچ اور ذلیل بتایا، یہ کیسے ہوسکتا ہیکہ کوئی ذات تو ذلیل ورذیل ہو اور اس کا پیشہ قابل احترام ہو، پیشہ کا احترام بھی بالواسطہ ذات کا احترام ہے۔

طبقات اور ذات پات کی اس تقسیم کو برہمن نے افقی کے بجائے عمودی رکھا، یعنی ہر ذات کے اوپر کوئی ذات اور ہر ذات کے نیچے کوئی ذات ہے، سب سے اوپر برہمن کی ذات ہے، اس عمودی تقسیم کے رگ وپے میں افضلیت وارذلیت کا زہر گھولا، یعنی ہر ذات اپنے سے اوپر والی ذات سے ارذل اور اپنے سے نیچے والی ذات سے افضل ہے، اس کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ ہر ذات اپنے سے اوپر والی ذات کی یا تو ذہنی غلام ہوگئی یا اس کے افضل ہونے پر حسد کرنے لگی اور ہر ذات اپنے سے نیچے والی ذات کو حقیر سمجھنے لگی اور یہ سمجھ کر کہ میں فلاں سے افضل ہوں اپنی سماجی حیثیت پر قناعت کرنے لگی، یوں حسد، عداوت، حقارت، سماجی برائی پر قناعت اور ذہنی غلامی جیسی بیماریوں نے بھارتی سماج کو اس قدر اپاہج بنادیا کہ یہاں برہمن واد اور ذات پات کے خلاف آج تک کوئی کامیاب بغاوت نہ ہوسکی، جس کا پورا فائدہ یک طرفہ طور پر برہمن وادیوں کو اور پورا نقصان یک طرفہ طور پر بھارت کی قدیم اقوام کو ہوا۔ ذات پات کی اس عمودی تقسیم میں اونچ نیچ کو شاستروں کے ذریعہ قانونی اور مذہبی حیثیت بھی دی گئی، ہر اوپر والی ذات کی مذہبی وقانونی حیثیت اپنے سے نیچے والی کی بہ نسبت برتر ہے، اور ہر نیچے والی ذات کی قانونی ومذہبی حیثیت اپنے سے اوپر والی کی بہ نسبت کم تر ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو ذات جتنی بڑی ہے اس کی ذمہ داریاں اتنی کم اور اس کے حقوق اتنے زیادہ ہیں اور جو ذات جتنی چھوٹی ہے اس کی ذمہ داریاں اتنی زیادہ اور حقوق اتنے کم ہیں۔

ذات پات کے اس نظام کے استحکام میں اگلے جنم میں برہمن یا اونچی ذات میں پیدا ہونے کی خواہش کو بھی بڑا دخل ہے، شاستروں کے مطابق جو اچھے کرم کرے اور دھرم کا پالن کرے وہ اگلے جنم میں اچھا پیدا ہوتا ہے، ورن ووستھا اور طبقاتی نظام کے اندر سماج میں سب سے اچھا برہمن ہے، وہ بھو دیو (زمینی دیوتا) ہے، لہذا جس کا کرم سب سے اچھا ہوگا اور خلوص کے ساتھ دھرم کا پالن کرے گا وہ اگلے جنم میں برہمن پیدا ہوگا، یہ وہ سوچ ہے جو شودر کو اس بات پر آمادہ کرتی کہ وہ دھرم کا اچھی طرح پالن کرے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے دھرم بھرسٹ ہوجاتا ہے، شودر کا دھرم کیا ہے؟ شاستروں کے مطابق شودر کا دھرم ہے صدق دل سے اوپر کے تینوں ورنوں کی خدمت کرنا اور اسے جو کام یا پیشہ سپرد کیا گیا اس کو انجام دینا، اس لیے جب کبھی شودر کا ضمیر اسے ملامت کرتا اور وہ ورن ووستھا کی خلاف ورزی کرنا چاہتا تو معا اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ اگر میں بغاوت کروں گا یا بھودیو کی نافرمانی کروں گا تو اگلے جنم میں پھر شودر ہی بنوں گا، یہ جنم تو برباد ہوا ہی اگلا جنم بھی برباد ہوجائے گا، اس لیے بھلائی اسی میں ہے کہ شاستر اور برہمن جو کہتے ہیں اس پر خاموشی سے عمل کرلوں؛ تاکہ اگلے جنم میں برہمن یا اونچی ذات کا فرد بن سکوں، بہتر یہی ہے کہ جو ہو رہا ہے اسے خاموشی

سے سہہ لوں ورنہ دھرم بھی بھرسٹ ہوگا اور اگلے جنم کا بھی ستیاناس ہوگا اور اس جنم میں بھی جینا دوبھر ہوگا۔

ذات پات کے اس بدترین نظام میں ذات کا شعور اتنا مضبوط ہے کہ فرد کے لیے ذات ہی سب کچھ ہے، نفع ونقصان کا دائرہ ذات تک محدود ہے، ہر فرد کے نزدیک اس کی ذات کا مفاد ہی سب کچھ ہے، وہ ذات کی باہر کی دنیا سے لاتعلق ہے، ذات کے شعور کو مضبوط کر کے برہمنوں نے سماج کو ایسا جکڑ دیا ہے کہ دوسری ذات والوں کے ساتھ کھانا پینا بھی گوارا نہیں کیا جاتا، دوسری ذات میں شادی بیاہ کی بات تو چھوڑ ہی دیجیے۔ اسی طرح ذات کے ساتھ پیشہ کو یا کہہ لیں کہ پیشہ کے ساتھ ذات کو اتنی مضبوطی سے جوڑا گیا ہے کہ ذات ہی پیشہ ہے اور پیشہ ہی ذات ہے، ہر ذات کا پیشہ متعین ہے اور ہر پیشہ کی ذات متعین ہے، برہمنی قانون کے مطابق ایک ذات والا دوسری ذات کے پیشہ کو نہیں اپنا سکتا۔ ذاتوں کی عمودی درجہ بندی کی طرح پیشوں کی بھی عمودی درجہ بندی کی گئی، اونچی ذات کے پیشے افضل سمجھے گئے اور نیچ ذات کے پیشے گھٹیا سمجھے گئے، اسی طرح اچھوت ذات کے پیشے ناپاک گردانے گئے۔

یہ ہے وہ برہمنواد اور ذات پات کا وہ نظام جس کے خاتمہ کے لیے بہت سی شخصیتیں اٹھیں اور بہت سی تحریکیں برپا ہوئیں؛ مگر برہمنواد کی عیاریوں اور کارستانیوں سے یہاں کا سماج ذات پات کی لعنت سے پاک نہ ہوسکا۔ ذات پات کے خاتمہ اور سماجی انصاف کے قیام کے لیے اس قوم کو کھڑا ہونا ہوگا جسے دنیا میں اس لیے برپا کیا گیا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی کی طرف لائیں اور دیگر مذاہب کے جور وستم سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے گہوارہ عدل وانصاف میں پناہ دیں ۔ یہ کام فریضہ امت بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی۔

کشور سلطانہ ۔حیدرآباد

غزل

پیامِ محبت کوئی ہم سے پوچھے
مقامِ اطاعت کوئی ہم سے پوچھے

جھکی کہکشاں ، جگمگائی جبیں تھی
عروجِ عقیدت کوئی ہم سے پوچھے

جو ہر آن پھولوں کی محفل سجائی
وہ شانِ ارادت کوئی ہم سے پوچھے

چلی آئی بارات یادوں کی اکثر
وہ حسنِ رفاقت کوئی ہم سے پوچھے

وہ شیریں کلامی کہ اپنا بنالے
زباں کی حلاوت کوئی ہم سے پوچھے

کنارہ نہیں کوئی دریا دلی کا
یہ فیضِ سخاوت کوئی ہم سے پوچھے

ہم اشکِ ندامت میں ڈوبے ہیں کشورؔ
یہ ذوقِ عبادت کوئی ہم سے پوچھے

ڈاکٹر صالحہ صدیقی (الہ آباد)

اتر پردیش کے گلشن ادب کو وبائے کرونا میں الوداع کہنے والی شخصیات

ہمارے بعد اس محفل میں افسانے کہاں ہوں گے
نگاہیں ہم کو ڈھونڈھیں گی، نہ جانے ہم کہاں ہوں گے

اتر پردیش (المعروف یوپی) بلحاظ آبادی بھارت کی سب سے بڑی اور رقبے کے اعتبار سے پانچویں بڑی ریاست ہے۔ اتر پردیش دریائے گنگا کے انتہائی زرخیز اور گنجان آباد میدانوں پر پھیلی ہوئی ریاست ہے۔ اتر پردیش علمی وادبی اعتبار سے بہت زرخیز رہا ہے، یہاں اردو اور ہندی دونوں ہی زبانوں کے تخلیق کاروں نے آبیاری کیں مثلاً ہندی نثر میں (۱) پریم چند، ناول نگار (۲) راہی معصوم رضا، مصنف ٹوپی شکلا اور آدھا گاؤں (۳) رویندر پربھات، ہندی ناول نگار (۴) شری لال شکلا، مصنف راگ درباری وغیرہ جب کہ اردو کی نثری اصناف میں اپنی خدمات انجام دینے والوں کی یوں تو طویل فہرست ہیں لیکن ان میں اہم ناموں میں (۱) فراق گورکھپوری (۲) حکیم سید ظل الرحمٰن، مصنف، طب یونانی پر کئی کتابیں لکھیں (۳) ابن صفی، ناول نگار جاسوسی دنیا (۴) عصمت چغتائی، مصنف (۵) مرزا محمد ہادی رسوا، مصنف امراؤ جان (۶) قرۃ العین حیدر، مصنفہ آگ کا دریا (۷) محمد رضی الاسلام ندوی مصنف اور ترجمہ نگار (۸) علامہ شبلی نعمانی وغیرہ اہم نام شامل ہیں۔ اردو کی شعری دنیا بھی اتر پردیش میں زرخیز رہی ہیں، یہاں کے مقبول ومعروف شعرا حضرات میں شامل ہیں (۱) اکبر الہ آبادی، شاعر (۲) علی سردار جعفری، اردو شاعر (۳) بیکل اتساہی، اردو شاعر (۴) چکبست، اردو شاعر (۵) دیا شنکر نسیم، اردو شاعر (۶) فراق گورکھپوری، اردو شاعر، گیان پیٹھ انعام یافتہ (۷) جگر مراد آبادی، اردو شاعر (۸) جوش ملیح آبادی، اردو شاعر (۹) کیفی اعظمی، اردو اور ہندی بول نگار، شاعر اور نغمہ نگار (۱۰) مجاز لکھنوی، اردو شاعر (۱۱) اثر لکھنوی (۱۲) مجروح سلطانپوری، شاعر اور بول نگار (۱۳) الطاف حسین حالی، اردو شاعر، غالب وسرسید کی سوانح لکھی (۱۴) میر انیس، اردو مرثیہ شاعر (۱۵) میر تقی میر (۱۶) مرزا غالب، کلاسیکل اردو اور فارسی زبان شاعر (۱۷) شوق بہرائچی مشہور مزاحیہ شاعر (۱۸) بابا جمال بہرائچی بہرائچ کے مشہور استاد شاعر، شاعر جمالی کے استاد (۱۹) رافت بہرائچی جگر بسوانی کے شاگرد اور بہرائچ کے مشہور شاعر (۲۰) رفیع بہرائچی جگر بسوانی کے شاگرد اور بہرائچ کے مشہور شاعر (۲۱) محمد نعیم اللہ خیالیار دو شاعر اور مصنف (۲۲) صفی بہرائچی مصنف افکار وصفی (۲۳) اظہار وارثیار دو شاعر (۲۴) عبرت بہرائچی اردو شاعر (۲۵) اثر بہرائچی اردو شاعر (۲۶) واصف القادری (۲۷) محسن زیدی (۲۸) فیض بہرائچی (۲۹) ظفر گورکھپوری وغیرہ وغیرہ ہندی ادب می بھی یہاں شاہکار شعرا گزرے جن میں شامل ہیں (۱) ہری ونش بچن، مصنف اور شاعر (۲) سوریا کانت ترپاٹھی (نرالا) (۳) مہادیوی ورما وغیرہ سرسید احمد خان، بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پنڈت مدن موہن مالویہ، بانی

بنارس ہندو یونیورسٹی، اتر پردیش کے موسیقاروں میں شامل ہیں بیگم اختر، غزل گلوکار، پنڈت کشن مہاراج، طبلہ نواز ،نوشاد، موسیقی ہدایت کار؛ خدمات برائے بھارتی سنیما کے لیے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ ملا۔روی شنکر، کلاسیکل ستار نواز، بھارت رتن یافتہ ہ؛1999 تین کریمی اعزاز حاصل کیے ،بسم اللہ خان، شہنائی نواز، بھارت رتن یافتہ (2001)گلوکاروں میں شامل ہیں ،ابھجیت بھٹاچاریا، از کانپور، انکیت تیواری، از کانپور، کیلاش کھیر، از میرٹھ ،شوبھا مڈگل ۔اردو کے مزاحیہ شعراؑ و اداکاروں میں جو نام مقبول عام ہے ان میں اکبر الہ آبادی، شاعر، ٹن ٹن، مزاحیہ اداکارہ ۔اسی طرح تخلیق کار/ ہدایت کاروں میں انوراگ کشیپ، ہدایت کار، فرحان اختر، ہدایت کار، کے آصف، تخلیق کار فلم مغل اعظم ۔اسی طرح گلوکاروں میں انکیت تیواری، بیگم اختر، سیدھی چوہان، بول نگاروں میں جنھوں نے اردو شعر و ادب میں بھی اپنا ممتاز مقام بنایا ان میں شامل ہیں :علی سردار جعفری، جاوید اختر، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، شکیل بدایونی، سانگ کمپوزر بھی یو پی کے خاصے مقبول ہوئے جن میں شامل ہیں :آنند ملند، نوشاد وغیرہ ۔اودھ کے نواب جنھوں نے اردو شعر و ادب کے فروغ میں کلیدی رول ادا کیا ،جن کے نام کے بغیر اردو کی تاریخ نامکمل ہے، ان میں شامل ہیں :واجد علی شاہ ،آصف الدولہ، چوتھے نواب، بانی جدید لکھنؤ ،واجد علی شاہ، شاعر، میر رقص، اودھ کے آخری نواب ۔اکبر کے نورتن میں شامل ٹوڈرمل، وزیر معاشیات اور اور اکبر کا نورتن، خان خاناں، ہندی شاعر اور اکبر کا نورتن۔ ٹیلی ویژن کے لیے اپنی خدمات دینے والوں میں راہی معصوم رضا، ٹی وی سلسلے رامائن کے مکالمے لکھے جرم، ابو سالم ،پھولن دیوی کا تعلق بھی اسی زرخیز زمیں سے رہا ہیں۔

آج پوری دنیا کرونا جیسی مہاماری میں مبتلا ہے۔کرونا نے جس طرح پوری دنیا کو اپنی چپیٹ میں لے لیا اور زندگی کی تصویر بدل ڈالی اس سے ادیب و شعراؑ کا حساس دل بھی لکھنے سے خود کو روک نہ سکا۔کرونا نے اردو ادب پر گہرے نقوش مرتب کیے، بقول شخصے ''ادب تنقید حیات'' ہے اس تعریف کو مشرق و مغرب میں ادب کی مقبول و معقول تعریف کہا جائے تو ہم شعر و ادب میں تاریخی سانحات کا عکس بھی دیکھ سکتے ہیں ۔کرونا کی صورت حال نے جس طرح پوری دنیا کو خوف و ہراس کی سیاہ بندگلی کی طرف دھکیل دیا ہے شاعروں نے اپنے کلام سے اس میں روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ایسا عالمہ سانحہ ہے جسے ادب و صحافت نے اپنے مزاج سے دیکھا اور اپنے منظر ناموں کا حصہ بنایا ۔خصوصا سوشل میڈیا نے اس میں اہم رول ادا کیا۔سوشل میڈیا پر کرونا نے وبائے عام کو ادب کے تخلیقی رویے کے طور پر دیکھنے کا رجحان پیدا کیا ۔غرضکہ اس وبائی منظر نامے میں ہندستان اور دیگر ممالک کے اعلیٰ و ارفع ادیبوں و شاعروں نے بہترین نگارشات کاغذ پر بکھیرا۔الیٹرانک میڈیا کے ساتھ پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا ہر جگہ اس کو موضوع سخن بنایا گیا۔اس حالات نے زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا۔بے شمار کام رک گئے ۔لیکن اس وقت سے لڑتے ہوئے باہمت لوگ آگے بھی بڑھے ۔جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا اس رسالہ کے مدیر ایک ایسے فعال اور نوجوان شاعر، ادیب اور صحافی ہیں جن پر جس قدر رشک کیا جائے کم ہے۔

2021 - 2020 پوری دنیا پر قیامت بن کر گزرا ۔خصوصا اردو دنیا کا ان دونوں سالوں میں قہر برپا

ہوا۔ بے شمار عظیم الشان شخصیات کو ہم نے کھو دیا۔ ان میں اہم ناموں میں شامل ہیں عزیز الحق عمری، عبدالمنان سلفی، مولانا سلمان مظاہری، مولانا احمد سعید پالن پوری، مولانا متین الحق اسامہ قاسمی، مولانا سید ولی اللہ قاسمی، قاضی اعظم علی صوفی، مولانا سید کاظم پاشا قادری موسوی، مولانا محمد حسین ابوالحقانی، مولانا محمد نصیر الدین، قاضی محمد سمیع الدین، ڈاکٹر احمد اللہ بختیاری، مولانا کلب صادق اور سید افضل قادری۔ رؤف خلش شاعر (حیدرآباد)، عبید صدیقی ادیب، براڈکاسٹر (دہلی) فاطمہ تاج افسانہ نگار (حیدرآباد)، پروفیسر صاحب علی درس و تدریس (ممبئی)، اجمل سلطان پوری شاعر (سلطان پور)، ولی بستوی شاعر، عالم دین (سہارنپور)، وکیل احمد طاہر قادرآبادی شاعر، معلم (اترپردیش)، ڈاکٹر لقمان سلفی مفسر، عالم دین (بہار/ سعودی عرب)، عبدالاحد ساز شاعر (ممبئی)، شاہد بگھونوی شاعر (سمستی پور)، محمد ضمیر الدین نظامی خوش نویس، خطاط (حیدرآباد)، اسرار جامعی مزاحیہ شاعر (دہلی)، انل ٹھکر ادیب، ڈراما نگار (کرناٹک)، اعجاز قریشی صحافی (حیدرآباد)، تسنیم انصاری برہان پوری شاعر (برہان پور) فاطمہ عالم علی، نثر نگار (حیدرآباد)، رشید انصاری صحافی (حیدرآباد) احمد عثمانی ادیب، صحافی مالیگاؤں) ہارون بی۔اے ادیب، صحافی (مالیگاؤں) مجتبیٰ حسین مزاح نگار (حیدرآباد) گلزار دہلوی شاعر (دہلی)، اختر جمال شاعر (بھیونڈی)، کبیر اجمل شاعر (بنارس) ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی، اسلامی اسکالر، محقق اعظم گڑھ/سعودی عرب، راحت اندوری شاعر (اندور) پروفیسر سید فضل امام رضوی (ادیب، ناقد لکھنؤ) نشتر امروہوی (شاعر امروہہ) مظفر حنفی شاعر، ادیب (دہلی) شکیل انوار صدیقی (ادب اطفال مرادآباد) مختار شمیم، ادیب، محقق، ناقد، مدھیہ پردیش، ڈاکٹر حنیف ترین، شاعر، ادیب (سری نگر)، رہبر جونپوری (شاعر لکھنؤ) شمس الرحمٰن فاروقی شاعر، ادیب، ناقد الہ آباد، مناظر عاشق ہرگانوی، مشرف عالم ذوقی تبسم فاطمہ، شوکت حیات، ترنم ریاض، رضا حیدر، شمیم حنفی، غلام مرتضیٰ راہی وغیرہ وغیرہ بے شمار اہم شخصیات ہم سے جدا ہو گئیں۔ اترپردیش بھی اس سے عاری نہیں۔ بے شمار علمی و ادبی شخصیات، فنکار ہم سے جدا ہوئے۔ اس مقالے میں ان میں سے اہم شخصیات کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی عالمگیر شہرت یافتہ ہندوستانی شاعر، ادیب، محقق، نقاد، مترجم، لغت نویس اور دیگر تخلیقی ذہنیت کے مالک ہمہ جہت ہمہ صفت تخلیق کار تھے۔ جن کی تحریروں میں برصغیر ہند و پاک کی تہذیبی روایات کی بازیافت دیکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے خود شعر و ادب کے تفہیمی منازل کا سفر طے کیا پھر اپنے قارئین کو اس عمل میں شامل کیا۔ وقت کے ساتھ ان کے اظہار کی نوعیتیں بدلتی رہیں اور خیال کی پرواز اور بلند ہوتی رہی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی ادبی فتوحات کا سلسلہ بہت طویل رہا ہے اور اس طویل سلسلہ میں کہیں ایک شاعر بھی موجود رہا ہے۔ جس پر کم کم ہی گفتگو کی جاتی ہے۔ تنقید اور فکشن کے علی الرغم فاروقی صاحب کی شاعری کے تعلق سے منفی تاثرات کثرت سے دیکھے سنے جا سکتے ہیں۔ کلیات (مجلس آفاق) میں فاروقی صاحب کے چار مجموعہ ہائے کلام گنج سوختہ، سبز اندر سبز، چار سمت کا دریا اور آسمان محراب کے ساتھ ان کے غیر مطبوعہ کلمات بھی شامل ہے۔ ان کی کلیات میں کلام کی ترتیب اصناف کے اعتبار سے ہے جن میں غزلیں، نظمیں، تراجم، بچوں کی نظمیں، قطعات

اور رباعیات سبھی کچھ شامل ہیں۔اس مضمون میں ہم ان کی غزل گوئی کا مطالعہ کریں گے۔فاروقی صاحب کی شاعری میں تجربہ ،تعقل تفکر ، گہرائی ،داخلیت مل کر قاری کو خاصی علمیت اور غور وخوض کا تقاضا کرتی ہیں۔مثال کے طور پر ان کی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں جو ان کے پہلے مجموعہ کلام ''گنج سوختہ''(۱۹۶۹) میں شامل ہیں:

میں بھی شہید شوخی حسن نمود تھا
یعنی حریف آتش پنہان دور تھا

دروازہ وجود تھا بند آئینے کی طرح
ہر حرف ہست خاک بیابان بود تھا

شمس الرحمٰن فاروقی کو ان کے چالیس سے زائد اردو انگریزی تصانیف اور کارناموں پر ہندوستان کی کم وبیش سبھی اکیڈمیوں اور ادبی اداروں نے انعامات سے سرفراز کیا ہے۔علاوہ ازیں ان کی ادبی قدر قیمت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ برصغیر کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ''سرسوتی سمان'' جو مالیت کے لحاظ سے بھی سب سے بڑا ہے، شمس الرحمٰن فاروقی کو ''شعر شور انگیز'' کے لیے ملا۔فاروقی اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھیں سرسوتی سمان سے نوازا گیا۔فاروقی صاحب کی شخصیت اور فن پر گفتگو یقیناً ایک وسیع موضوع ہے جسے چند صفحات میں سمیٹنا ممکن نہیں، اس لیے یہاں اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔

شمیم حنفی

کووڈ میں اتر پردیش کو الوداع کہنے والی شخصیات میں اہم نام شمیم حنفی کا بھی شامل ہیں، ان کا جانا اردو ادب کا بڑا نقصان رہا۔شمیم حنفی 6 مئی 2021 کو نئی دہلی میں کووڈ۔19 کے سبب اس جہان فانی کو الوداع کہہ دیا۔اس موقع پر آرٹس کونسل، کراچی کے صدر احمد شاہ نے شمیم حنفی کی موت پر غم کا اظہار کیا اور کہا کہ "شمیم اپنے ادبی کاموں کی وجہ سے ہم میں زندہ رہیں گے۔"شمیم حنفی صاحب کی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالے تو معلوم ہوگا کہ شمیم حنفی 17 نومبر 1938ء کو سلطان پور میں پیدا ہوئے۔انھوں نے 1967ء اور 1972 میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے اور الہ آباد یونیورسٹی سے ایک پی ایچ ڈی اور 1976ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کیا۔شمیم حنفی کو 2010 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) عدالت کا رکن منتخب کیا گیا تھا۔انھوں نے اے ایم یو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (جے ایم آئی) میں تعلیم دی اور پروفیسر ایمریٹس کی صلاحیت میں جے ایم آئی سے وابستہ رہے۔جے ایم آئی میں انھوں نے انسانیت اور زبان کی فیکلٹی کے ڈین کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، جہاں سے انھوں نے 2012 میں استعفیٰ دیا تھا۔شمیم حنفی نے جشن ادب اور ریختہ کے سرپرست کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی ہیں۔شمیم حنفی کو 2015 میں بھارتیہ جنانپتھ کے ذریعہ پہلا جنن گریما نند النکرن ایوارڈ دیا گیا تھا۔انہوں نے قطر میں مقیم ایک ادبی تنظیم "مجلسِ فروغِ اردو ادب" سے جنوری 2021 میں "اردو ادب کے فروغ کے لیے بین الاقوامی ایوارڈ" (International award for promotion of Urdu literature) حاصل کیا۔انھیں "مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ"، "پرویز شاہدی ایوارڈ"، "دہلی اردو اکیڈمی ایوارڈ" اور "غالب ایوارڈ" بھی مل چکا ہے۔20 ستمبر 2015 کو، انہیں ہندوستان گیان پیٹھ سے نوازا گیا۔

شمیم حنفی نے اپنا پہلا ڈراما "آخری کش" لکھا، جسے 1965ء میں ان کے دوست امین حنفی نے تیار کیا تھا۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رسالہ "جامعہ" کے مدیر رہ چکے ہیں۔ ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے انھوں نے مٹی کا بلاوا، بازار میں نیند اور مجھے گھر یاد آتا ہے سمیت کئی ڈرامے لکھے ہیں۔ جون 2015 میں ان کا شعری مجموعہ آخری پہر کی دستک ہندی کے شاعر اشوک واجپئی نے جاری کیا۔ 2012 میں آرٹس کونسل، کراچی کے زیر اہتمام، شمیم حنفی نے اردو کانفرنس میں ریمارکس دیے کہ، "کتابیں ہماری یکجہتی کا احترام کرتی ہیں" اور "انفارمیشن ٹکنالوجی کی آمد نے کتابوں اور مشینوں کے مابین تنازعات کو جنم دیا ہے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک، تاریخ، روایت کے بھی مرتب ہیں۔ ان کی کتابوں میں شامل ہیں: جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، نئی شعری روایت، تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ، اردو کلچر اور تقسیم کی روایت، خیال کی مسافت، قاری سے مکالمہ، منٹو: حقیقت سے افسانے تک، غالب کی تخلیقی حسیت، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، غزل کا نیا منظر نامہ۔ ترقی پسند تحریک، جدیدیت، فکر اقبال اور معاصر ادبی رویے پر کھل کر بات کرنے میں شمیم حنفی نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو تدریس سے وابستہ رہ کر موصوف نے ہزاروں تشنگان ادب کو مئے نوش کے آداب سکھائے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی آپ کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ پروفیسر ایمریٹس کی حیثیت سے شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے منسلک رہتے ہوئے، شمیم حنفی نے دہلی اور بیرون دہلی سینکڑوں ادبی اجتماعات میں کلیدی خطبات پیش کیے۔ پروفیسر شمیم حنفی کا شمار اردو کے ممتاز ترین نقادوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ادبی تنقید کے موضوع پر متعدد مقالات علمی تصنیف کیے۔ ان کتابوں میں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، نئی شعری روایت، تاریخ تہذیب اور تخلیقی تجزیہ، اردو ثقافت اور تقسیم کی روایت، خیال کی مسافت اور قاری سے مکالمہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ بحیثیت ادبی ناقد مشرقی شعریات پر ان کی نگاہ بہت گہری تھی۔ خصوصیت کے ساتھ شاعر مشرق اقبالؔ کے فکری مباحث کا مطالعہ انھوں نے بہت باریک بینی کے ساتھ کیا تھا۔ وہ نہایت اعتماد کے ساتھ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے معترف تھے۔ اس ضمن میں ان کی کتاب 'اقبال اور عصر حاضر کا خزانہ' سے یہ اقتباس نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے:

''اقبال ہماری فکری روایت کے سب سے بڑے مفسر تھے۔ اپنی آگہی اور وسعت فکر کے لحاظ سے اقبال کا کوئی پیش رو اور کوئی ہم عصر ان کے رتبے کو نہیں پہنچتا۔ اردو کی فلسفیانہ روایت اور اجتماعی فکر کا نقطہ عروج ہمیں اقبال کی شاعری اور نثر میں نظر آتا ہے۔''(۲)

اردو تنقید کے ساتھ ساتھ شمیم حنفی شاعری اور فنون لطیفہ سے بھی غیر معمولی وابستگی رکھتے تھے۔ دنیا کی بے ثباتی کلاسیکی شاعری کا اہم ترین موضوع رہا ہے۔ اس حوالے سے بھی شمیم حنفی بہت سنجیدگی کے ساتھ پرورش لوح و قلم کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنے مرحوم والدین کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے نظم بعنوان 'مرحوم والدین کے نام' لکھی تھی۔ نظم کے اشعار یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ ان کا مطالعہ کائنات کتنا وسیع تھا۔ شمیم حنفی یقیناً اردو ادب کے بڑے اور اہم نام تھے، جن کی کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا، آج بھلے ہی وہ ہمارے درمیان نہ ہو لیکن ان کی تخلیقات سے آنے والی نسل آبیاری حاصل کرتی رہے گی۔

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تہذیبی وثقافتی پہلو

۱۸۵۷ء غدر کا زمانہ تھا، ہندوستانی باشندوں پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، خاص طور پر مسلمان مشق ستم کا شکار تھے، اعظم گڑھ پر اسی لپیٹ میں تھا، مجاہدوں کے ایک دستہ نے اعظم گڑھ کے ڈسرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا، سارے قیدی جس سے آزادی کی فضاء میں سانس لینے لگے، ٹھیک اسی تاریخ یعنی ۳؍جون ۱۸۵۷ء کو علامہ شبلی نعمانی پیدا ہوئے، شعور کی منزلوں تک پہونچتے پہونچتے ان کو مذہبی جھگڑے، جگہ جگہ فساد اور آزادی کے لئے جلسے جلوس وغیرہ دکھائی دئے، اسی ماحول میں وہ باشعور ہو گئے، ان کے اساتذہ نے ان کی ذات میں اسلامی تہذیب وثقافت کو نقش کر دیا تھا، اور ان کو انسانوں اور مسلمانوں کی بقاء کے لئے اسلامی تہذیب وثقافت کے علاوہ ان کے سامنے کوئی مثال نہ تھی، کیونکہ ان کو مسلمانوں کا ماضی شاندار نظر آیا، انیسویں صدی آخر اور بیسویں صدی کا اول کچھ ایسے ہنگامی حالات سے گذر رہا تھا کہ اس وقت جس کے بھی دل میں کسک وتڑپ ہوگی یا تو اس کا اظہار نثر میں کرے گا یا تو نظم میں کرے گا، مولانا شبلی نے دونوں میں کیا ہے، نثر میں زیادہ ہے، الفاروق، المامون، الغزالی، سیرۃ النبی ﷺ وغیرہ اسی عصر کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، انہوں نے ان عظیم شخصیات کو منتخب کر کے اسلامی تہذیب وثقافت کو پیش کیا ہے اور لوگوں کو آگاہ کیا کہ ان جیسی شخصیات کو آئیڈیل بنایا جائے، مولانا شبلی کے تعلق سے عبدالماجد دریا آبادیؒ کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''شبلی جس میں بیک وقت ایک شاعر وسخن وسنج، ایک مؤرخ ومحقق، ایک مبصر وناقد، ایک عالم ومعلم، ایک ادیب وانشاء پرداز، ایک مصنف واہل قلم کے کمالات جمع تھے'' (ادیب شبلی نمبر ص ۷)

عبدالماجد دریا آبادی نے ان دو سطروں میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے ہشت پہلوؤں پر طائرانہ نگاہ ڈال دی ہے اور ان میں انہوں نے شاعری کو مقدم کیا ہے، ڈپٹی نذیر احمد کہتے ہیں:

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں اور نعمانی

علامہ شبلی نے بہ نسبت نثر کے شاعری کو کم چھوا ہے، مگر مختصر مفید ہے، شبلی کی شاعری میں غزلیں، مثنوی، قصیدہ، مذہبی، اخلاقی وسیاسی نظمیں مرثیہ اور قطعات ہیں، یہ ساری شاعری بکھری ہوئی تھی، ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندویؒ نے یکجا کر کے مرتب کیا، اور کلیات شبلی اردو کے نام سے دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے شائع کروایا، اس کلیات میں سید سلیمان ندوی نے ان کی غزلوں کو جگہ نہیں دیا، باقی صنفیں پائی جاتی ہیں، مثنوی جس کا نام ''صبح امید'' ہے اس میں شبلی نے سہ زمانی تہذیب کو بیان کیا ہے، کہ عرب کی حالت دگر گوں تھی، مصر ویونان اور فارس اپنے آپ کو مہذب سمجھ رہے تھے، اس دور کا نقشہ کچھ یوں کھینچتے ہیں، شعر میں ملاحظہ

فرمائیں:

اپنی تو ہمیں نہ کچھ خبر تھی
اوروں کے عیوب پر نظر تھی
لڑ پڑتے تھے بات بات میں ہم
ڈوبے تھے تعصّبات میں ہم

مثنوی میں تہذیبی بدلاؤ اور ثقافت کو بیان کرتے ہوئے سرسید کی تصویر اس طرح کھینچی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

صورت سے عیاں جلال شاہی
چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی
چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی

جس طرح سرسید کی عظمت کا اعتراف ہے اسی طرح ریش سے باریک اشارہ کے ساتھ اسلامی تہذیب کو آشکارا کیا گیا ہے، مثنوی ''صبح امید'' میں علامہ شبلی نے ماضی کی تاریخ اور حال کی کیفیت بیان کرتے ہوئے سرسید کی فکر کو مستقبل کی امید قرار دیا ہے۔

قصیدہ تماشہ عبرت میں شبلی نے صدیوں کی تہذیب وثقافت کو بیان کرکے ان کی بحالی کے لئے تڑپ رہے ہیں،

مرو شیراز وصفہان کے وہ زیبا منظر
بیتِ حمراء کے وہ ایوان وہ دیوار و در
مصر وغرناطہ و بغداد کا ایک ایک پتھر
اور وہ دہلیِ مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر

ان کے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انہیں سب یاد ہیں ازبر اب تک

بالا اشعار میں مرو شیراز وصفہان، مصر وغرناطہ و بغداد اور دہلی میں ایسے ایسے ایوان ومحل تعمیر ہوئے جس میں اسلامی تہذیب وثقافت کی چھاپ تھی، امراء اور بادشاہوں نے ان پر قرآن مجید اور حدیث پاک کو اس انداز سے کندہ کرایا تھا کہ دیکھنے کے بعد پوری تہذیب ذہنوں ودماغ میں گھوم جاتی تھی، شبلی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج بھی ان بوسیدہ کھنڈرات اور محلوں میں داستانیں موجود ہیں، جو لوگوں کی زبان پر ازبر جاری ہیں اور ان کی چمک آج بھی محسوس کی جاسکتی ہیں۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کی تاریخی اور اخلاقی نظموں کے بارے میں سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''مولانا نے تاریخی اور اخلاقی نظموں کے دو الگ سلسلہ شروع کئے جن میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اردو کے بڑے بڑے ضخیم دیوانوں کے مقابلہ میں بھاری ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اردو ادب میں ان کی کوئی مثال نہیں، اور نہ اب تک ان کی تقلید کی جاسکی، ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے انمول موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر قومی اخلاق کے حسن کو دوبالا کیا، دوسری طرف ہماری زبان کی شاعری میں صحیح واقعات کو نظم کرنے کی بہترین نمونے پیش کئے اکثر کہا گیا ہے کہ بہترین شاعری وہی ہے جس میں جھوٹ یعنی مبالغہ اور خیال آرائی کا حصہ زیادہ ہو، مگر مولانا کی ان نظموں نے دکھادیا کہ واقعیت کی سطح پر شاعری کا کمال دکھایا جاسکتا ہے'' (بحوالہ: کلیات شبلی اردو ص ۱۷)

سید سلیمان ندویؒ نے ہوسکتا ہے کچھ باتیں اپنے استاذ کی محبت میں کہی ہوں لیکن اگر اس کا جائزہ لیا جائے اور

پوری اردو شاعری پر نظر ڈالی جائے تو شبلی تاریخی و اخلاقی نظموں میں خشت اول کی طرح ہیں، اسی طرح کی باتیں ڈاکٹر سلام سندیلوی نے بھی کہی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کی شاعرانہ عظمت کا ایک ثبوت اور بھی ہے، انہوں نے اسلامی نظمیں کہہ کر اردو میں ایک طرحِ نو ڈال دی، اسی طرح نو پر بعد میں اقبال میں تخیل کا ایوان تعمیر کیا، اس لحاظ سے شبلی کو اقبال کا پیش رو کہا جاسکتا ہے، اور یہ فخر شبلی کے لئے کچھ کم نہیں'' (ادیب شبلی نمر ۱۶۷)

دونوں اقتباس میں غور کیا جائے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ شاعری میں سچے واقعات کو بیان کرنے کی ابتدا شبلی نے کی ہے اور اس کو پروان چڑھایا علامہ اقبال نے اور اس نئے موضوع اور اسلوب کو اچھی نظروں سے دیکھا گیا اور اس کا اثر بھی پڑا، چنانچہ حفیظ جالندھری، ماہر القادری، عامر عثمانی اور ضیاء القادری وغیرہ نے اس طرح کی خاصی نظمیں لکھی ہیں۔

کلیات شبلی اردو میں مولانا شبلی کی اخلاقی نظموں کی تعداد انیس ہے، ان میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ''اہل بیت رسول اللہ ﷺ کی زندگی'' اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینے پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار
گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا ہے لباس مبارک غبار سے
جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا

اس نظم کا آخری شعر:

یوں کہ ہے اہل بیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرا دختر خیر الانام تھا

ان اشعار میں اس عصر کی تہذیبی وثقافتی پہلو کو بیان کیا گیا ہے، مالداروں کے پاس گھر میں کام کرنے کے لئے کنیز اور غلام ہوا کرتے تھے، حضرت فاطمہ کا معاملہ تھا کہ گھر میں چکی پیسنے کی وجہ سے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں گھس گئی تھیں، پانی بھرنے کی وجہ سے کاندھا بھی نیلا ہو گیا تھا، جھاڑو مارنے کی وجہ سے لباس گندہ ہو جایا کرتا، حضرت فاطمہ نے سوچا کہ اپنے والد محمد ﷺ سے کوئی کنیز اور غلام مانگ لائیں تاکہ ان محنتوں سے کچھ چھٹکارا مل جائے، گئیں مگر ہمت نہ ہوئی، یہ بھی ایک تہذیبی پہلو ہے، واپس گئیں، دوسرے دن حاضر ہوئیں ،حضور ﷺ پوچھ رہے ہیں، حیاء کی وجہ سے بول نہیں پا رہی تھیں، حضرت علیؓ نے مقصد کو بیان کیا، حضور ﷺ نے جواب دیا کہ کچھ لوگوں کا حق تم سے مقدم ہے خاموش ہو کر سیدہ پاک لوٹ آئیں، شبلی آخری مصرعہ میں جو کہہ رہے ہیں کہ یہ اس دختر کا عالم ہے جو مخلوق میں سب سے بہتر ہے، اس نظم میں شبلی نے عورتوں اور مردوں کے لئے اسلامی تہذیب پر بہت اہم عنصر پیش کیا ہے، جہاں تک ہو سکے اپنا کام اپنے سے کرنا چاہئے، اور اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کی ذات کا خیال رکھا جائے، شبلی کی ایک بہت مشہور نظم ہے جو نصابوں میں شامل ہے، وہ ہے عدل جہانگیری، نور جہاں بام پر بیٹھی تھیں، کسی کا گذر ہوا اس کی نگاہ نور جہاں پر پڑ گئی غیرت نے للکارا، نور جہاں نے طمنچہ اٹھا کر گولی داغ دی، جس کی وجہ سے وہ برسر موقع ہلاک ہو گیا، یہ مقدمہ عدالت میں پہونچا، اس نے

قصاص کا حکم نافذ فرمایا، جہانگیر کو اس پر عمل کرنا ہے جبکہ نور جہاں اس کی چہیتی بیوی ہے، مگر اس نے عدل وانصاف کے لئے اپنی محبت کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوگیا، شبلی نے نور جہاں کے تعلق سے جو شعری اسلوب اختیار کیا ہے اس کے پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں شعریت بھرپور پائی جاتی ہے، اور بلاغت کی معراج کا پہلو کھل کر سامنے آجاتا ہے، ساتھ ساتھ یہ تہذیبی پہلو بھی نکلتا ہے کہ ملکہ در پردہ زمانہ کی بادشاہ ہوا کرتی ہے، اگر اس کی ہیبانی پر بل آجائے تو حکومتوں کا تختہ الٹ جایا کرتا ہے، شبلی فرماتے ہیں:

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردے میں شہنشاہ زمن
اس کی پیشانی نازک پر جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

جہانگیر نے جلاد کو حکم دیا کہ محبت اپنی جگہ، عدل اپنی جگہ، کچھ ایسی صورت بنی کہ مقتول کے ورثہ خون بہا پر راضی ہوگئے، جہانگیر نے خون بہا ادا کر دیا اور کہا کہ اگر آج تو قتل کر دی جاتی تو میرا کیا عالم ہوتا، شبلی نے اس نظم میں عورت کی حیاء، پردے میں ملکہ، بادشاہ کی محبت، عدل کی بے مثال نظیر کو اس انداز سے پیش کیا کہ دنیا والوں کو اسی تہذیب کو اختیار کرنا چاہئے۔

بہر حال اس بات میں پس وپیش نہیں کیا جاسکتا کہ شبلی نے اپنی اردو شاعری میں اسلامی تہذیب وثقافت کو اپنی فکر کا ادبی محور قرار دیا ہے، اور سچے واقعات کو شاعری کے پیکر میں ڈھال ایک طرف انہوں نے اردو ادب کی خدمت کی ہے، تو دوسری طرف ایک نئے طرز کی کونپل کھلائی ہے، ساتھ ساتھ تہذیب وثقافت کے پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے، وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے مقالہ کو شبلی کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چند ِ مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

یہ شعر شبلی کی قبر کے کتبہ پر کندہ ہے، جو ان کی تہذیبی فکر کو یاد دلاتا ہے۔

کتابیات:

۱۔الیاس اعظمی ڈاکٹر شبلی شناسی کے سو سال ادبی دائرہ اعظم گڑھ یوپی، 2014

۲۔خلیق انجم ڈاکٹر شبلی کی علمی وادبی خدمات انجمن ترقی اردو، ہند نئی دہلی 1996

۳۔سلیمان ندوی سید مولانا حیات شبلی دارالمصنفین، اعظم گڑھ، طبع جدید 2008

۴۔شاہد نوخیز اعظمی ڈاکٹر ارمغان شبلی الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد 2006

۵۔شبلی نعمانی، مرتب سید سلیمان ندوی کلیات شبلی اردو دارالمصنفین، اعظم گڑھ 2008

۶۔محمد محامد ہلال اعظمی مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی 2014

۷۔نیر جہاں ڈاکٹر مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ دہلی 1999

۸۔رسالہ ''فکر وتحقیق، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جنوری، فروری، مارچ 2010

۹۔میگزین شبلی کالج، اعظم گڑھ، اکتوبر 1978

شاہ نواز ہاشمی۔حیدرآباد

غزل

وقت یہ آج ہم سے کہتا ہے
عزم ہمت سے کام لینا ہے

آندھیوں میں چراغ اپنا بھی
رخ ہواؤں کے موڑ دیتا ہے

ہم کو پابند کرکے کہتے ہیں
دہشتوں سے تمہارا رشتہ ہے

کچھ سیاسی مفاد کی خاطر
بے قصوروں کو گھیر رکھا ہے

بات اجالوں کی کرنے والوں نے
ظلمتوں میں ہمیں ڈھکیلا ہے

نوجوانو! ذرا سنبھل جاؤ
جال دشمن بچھائے بیٹھا ہے

باغبانی وطن کی ہم نے کی
اور لہو دے کے اس کو سینچا ہے

جو بھی ہوگا وہ سونچا جائے گا
سچ مگر ہاشمی کو کہنا ہے

قمر صدیقی۔ممبئی

غزل

یقین ٹوٹ گیا ہے گمان باقی ہے
کہ تیر ختم ہوئے سب ، کمان باقی ہے

ہماری ساری زمینیں ہیں چھن گئی تو کیا
ہمارے سر پہ ابھی آسمان باقی ہے

ابھی تو راہ میں آئیں گی مشکلیں کتنی
ابھی تو حوصلوں میں اپنے جان باقی ہے

یہ خاک وخون کی ہولی نہیں ہے رکنے کی
ابھی تو جلنے کو میرا مکان باقی ہے

ابھی سے نوحہ نہ تہذیب کا پڑھو یارو
ابھی تو اپنی یہ اردو زبان باقی ہے

عدو نے مورچہ تو کر لیا ہے سر لیکن
ابھی بھی راہ کی بھاری چٹان باقی ہے

شجر بریدہ چمن پر قمر ہے کیوں افسوس
پروں میں جان ہے جب تک اڑان باقی ہے

سیدہ تبسم منظور ناڈکر۔ممبئی

لفظ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں!!

ہماری زندگی ہمیشہ مختلف مراحل سے گزرتی رہتی ہے . اور ہمیں بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا رہتا ہے۔ہمیں زندگی میں کئی طوفانوں سے ٹکرانا پڑتا ہے، معاملات سے نپٹنا پڑتا ہے۔ہم بہت سارے طریقے اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ان باتوں سے گزرتے رہتے ہیں۔عجیب بات یہ ہے کہ زندگی کے معاملات کو درست کرنے اور خوشگوار کرنے میں مددگار بہت ساری باتوں کو ہم اہمیت نہیں دیتے۔ اگر ہم ان باتوں پر دھیان دیں تو ہمیں بہت ساری پریشانیوں سے نجات مل سکتی ہے۔ایسے ہی باتوں میں ایک صلاحیت ہے اور وہ ہے 'الفاظ' کا درست اور برمحل استعمال دیکھا گیا ہے کہ ہم لفظوں کے صحیح اور برمحل استعمال کو کبھی اہم اور مقدم نہیں سمجھتے۔ کچھ الفاظ کہنے اور سننے میں تو بہت نزاکت رکھتے ہیں لیکن اپنی معنی کی وجہ سے بہت سخت اور کھردرے ہوتے ہیں۔لفظوں کے بھی بہت ذائقے ہوتے ہیں، بولنے سے پہلے چکھ لینا چاہئے۔سچ کہیں تو کڑوے لفظ کہنے والوں کا کچھ نہیں جاتا۔۔۔یہ تو ان کو سہنے والوں کا ظرف ہوتا ہے کہ وہ اسے پی جاتے ہیں۔ اس طرح کی کڑوی بات کرنے والے لوگ اپنے رویوں میں ضد، انا کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔ دوسروں پر سبقت لے جانے کی کوششیں کرنا، خود کو ہی بہت کچھ سمجھنا، دوسرے سے بدتمیزی، بدلحاظی، بداخلاقی، من مانی کرنا ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔

لفظ بہت نایاب اثاثہ ہوتے ہیں۔ان کی حرمت کا پاس رکھنا بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ یہ الفاظ بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔۔۔الفاظ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔۔۔کسی کے ساتھ اچھے روپ میں تو کسی کے ساتھ برے روپ میں۔۔۔۔کیونکہ لفظوں میں رنگ بھی ہے، روپ بھی ہے، ناپ بھی ہے، گہرائی بھی ہے۔کسی کے کہے ہوئے الفاظ زندگی بھر یاد رہتے ہیں۔اچھے کہے ہوئے بھی اور برے بھی۔۔۔۔یہ الفاظ ہی ہیں جو مرہم بن کر زندگیاں بچاتے ہیں۔۔۔یہ الفاظ ہی ہیں جو زہر بن کر جان بھی لیتے ہیں۔۔۔۔کبھی تیر بن کر دل میں چبھتے ہیں تو کبھی سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں اور زندگی بنا جاتے ہیں۔ میٹھے اور پرخلوص الفاظ کسی کی روح کو تروتازگی بخش دیتے ہیں اور اگر یہی الفاظ زہر آلود اور حقارت بھرے ہوں تو جیتے جی مار دیتے ہیں۔اچھے برے الفاظ کا ذخیرہ تو ہر کسی کے پاس ہوتا ہے مگر الفاظ کا چناؤ ہی ان الفاظ کو انمول بناتا ہے۔تیر، تلوار، چاقو سے بھی زیادہ گہرا زخم دے جاتے ہیں یہ الفاظ۔۔۔گفتگو کرتے وقت لفظوں کے چناؤ کا بہت خیال رکھنا چاہئے۔

الفاظ کی اپنی ہی ایک دنیا ہوتی ہے۔ ہر لفظ اپنی ذمہ داری نبھاتا ہے۔کچھ لفظ حکومت کرتے ہیں تو کچھ غلامی۔ کچھ لفظ حفاظت کرتے ہیں اور کچھ وار کرتے ہیں۔ ہر لفظ کا ایک مکمل وجود ہوتا ہے۔لفظ صرف معنی نہیں رکھتے یہ تو

دانت بھی رکھتے ہیں۔۔۔۔ جو کاٹ لیتے ہیں۔۔۔۔ یہ ہاتھ بھی رکھتے ہیں جو کسی کے گریبان کو چاک کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ پاؤں بھی رکھتے ہیں جو ٹھوکر لگا دیتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ زہر بھی رکھتے ہیں اور مٹھاس بھی۔۔۔۔ اور ان لفظوں کے ہاتھوں میں اگر لہجہ کا بارود تھما دیا جائے تو پھر تو یہ پورے وجود کو چھلنی چھلنی کر دیتے ہیں۔

الفاظ ہی بتاتے ہیں کہ آپ کو اوروں کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے یہ الفاظ نہ ہوں تو شاید کچھ بھی نہ ہو۔ کئی لوگوں کو اس قدر بولنے کی عادت ہوتی ہے کہ بس بولے چلے جاتے ہیں۔ وہ کیا کہہ رہے ہیں، ان کی باتوں کا سامنے والے پر کیا اثر ہو رہا ہے، کچھ نہیں سمجھتے۔ کبھی کبھی کہے گئے الفاظ چاقو کی دھار سے بھی تیز ہوتے ہیں اور یہ زخم کبھی نہیں بھرتے۔۔۔ بس رِستے رہتے ہیں اور ہمیشہ یاد رہ جاتے ہیں۔۔۔۔ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

ادا کئے گئے لفظوں سے ہی انسان کا کردار پتہ چلتا ہے۔ ہر انسان ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہوتا ہے۔ آپ کو کہیں بھی خاموشی نہیں ملے گی آپ کسی بھی محفل میں جاتے ہیں، کہیں بھی جاتے ہیں ہر انسان دوسرے انسان سے گفتگو میں مشغول ہوتا ہے ہر کوئی کسی نہ کسی سے بات کر رہا ہوتا ہے، چاہے وہ معنی خیز ہو، چاہے وہ بے معنی ہو، بس بات کرتے رہنا چاہتے ہیں، بولنا چاہتے ہیں۔ کیا صحیح ہے؟ کیا غلط ہے؟ کیا سچ ہے؟ کیا جھوٹ ہے؟ اس کو جانچے بنا ہم بولنا چاہتے ہیں۔

اب تو تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہے اور بہت تعلیمی یافتہ ڈگری ہولڈر بھی بہت ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں پڑھے لکھے نہیں لگتے۔ پہلے لوگ کم پڑھے لکھے ہوتے تھے ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر سوجھ بوجھ تھی جو بھی کہتے، مگر اپنے لفظوں سے لوگوں کے دل چھلنی نہیں کرتے تھے۔ اب کیا وجہ ہے؟ ہمارے پاس بیشمار لفظوں کا ذخیرہ ہوتے ہوئے بھی کیوں ہم بولنے میں لفظوں کا مناسب استعمال نہیں کرتے؟ یا پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ان پڑھ ہیں جو صحیح لفظوں کا انتخاب نہیں کرتے اور اپنے الفاظ سے اوروں کو نشتر چبھوتے ہیں۔

پہلے کہانی افسانہ ناول اور کئی کتابیں پڑھتے تھے جس سے لفظوں کا ذخیرہ جمع ہوتا تھا مواد ملتا جو نہ صرف پڑھنے والے کی تسکین کرتا بلکہ پڑھنے والے کے علم میں بھی اضافہ کرتا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ پڑھنے والے کو خوبصورت الفاظ ملتے۔ لوگوں کو نئے موضوعات پر گفتگو کرنے کے لئے مواد ملتا۔ اب تو انسانی زندگی سے کتاب کب کی چلی گئی، لفظ بے وقعت ہو گئے، لوگوں کا قیمتی وقت انٹرنیٹ اور شوشل میڈیا نے لے لیا۔ لفظ شائستگی کی علامت تھے، اب بے وقعت ہوئے اور اپنی قیمت کھو رہے ہیں۔ الفاظ بلکل چابیوں کی طرح ہوتے ہیں. جیسے چابی کے استعمال سے تالا کھول سکتے ہیں بند کر سکتے ہیں اسی طرح یہ الفاظ کی چابیاں لوگوں کے دل کھول بھی سکتے ہیں. اور زبان بند بھی کر سکتے ہیں. الفاظ میں وہ طاقت ہے جس سے دوسروں کے دل میں جگہ بھی بنائی جا سکتی ہے اور دل سے اترا بھی جا سکتا ہے. ان ہی لفظوں کے اشک بنتے ہیں جو زباں سے کبھی ادا نہیں ہوتے۔ اپنے لفظوں کے بارے میں محتاط ہو جائیں انہیں ادا کرنے سے پہلے سوچ لیں کہ یہ کسی کے وجود کو سمیٹیں گے۔ یا پھر اس کے وجود کو کرچی کرچی کر کے بکھیر دیں گے۔

سی فوزیہ۔ ریسرچ اسکالر ایس وی یونیورسٹی تروپتی، آندھراپردیش

"تلک الایام"۔۔۔۔۔ماضی، حال اور مستقبل کی بازگشت

اکیسویں صدی کو فکشن کی صدی سے منسوب کرنا قطعی غلط نہ ہوگا۔ چونکہ اس صدی کے اوائل میں اور اب تک بے شمار متنوع موضوعات وطرح طرح کے پیروں پر مشتمل ناول اور افسانے منظر عام پر آ، چکے ہیں جن میں "تلک الایام" بھی ایک منفرد ناول کے طور پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب رہا ہے۔ اس ناول کے تخلیق کار دکن کی جانی مانی شخصیت بین الاقوامی شہرت یافتہ فکشن نگار نورالحسنین ہیں۔ نورالحسنین کی پیدائش 19۔ مارچ، 1950ء کو اورنگ آباد کے ایک جاگیر دارانہ علمی وصوفیانہ گھرانے میں ہوئی۔ والد بور التوحید نقشبندی کا تعلق آصف ماہی سلطنت سے تھا، والدہ ماجدہ فوزیہ بیگم بھی ہماری جاگیردارانہ گھرانے میں پیدا ہوئیں تھیں۔ اسی لئے نورالحسنین کی صفت میں جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ کے علاوہ صوفیانہ رنگ بھی شامل ہے۔ یہی صوفیانہ رنگ کی جھلکیاں ان کے چوتھے ناول "تلک الایام" میں جا بجا جھلکتی ہیں۔

"تلک الایام" خالص عربی لفظ ہے جس کے معنی "وہ دن" یعنی ایام گذشتہ کے ہیں۔ بام کے مناسبت سے نورالحسنین نے اپنے اس منفرد ناول میں گزرے ہوئے دنوں کے ساتھ حال میں داخل ہوتے ہوئے، وطن عزیز میں مسلمانوں کے حالات زار کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس بیک وقت تہذیب رفتہ کے ساتھ ساتھ موجودہ اطوار کو ایک ساتھ مدغم کرتے ہوئے نہایت عمدگی کے ساتھ اس ناول کو تخلیق کیا ہے کہ قاری کو کسی طرح کی الجھن محسوس نہیں ہوتی۔ قاری کبھی ماضی کے ان دیکھی تہذیب کی سیر کرنے لگتا ہے تو کبھی حال میں چلا آتا ہے۔ جب وہ ماضی کی وادیوں میں پہنچتا ہے تو مکمل طور پر خود کو صوفیانہ ماحول میں محسوس کرتا ہے جہاں صرف روحانیت ہی روحانیت غالب ہے۔ جہاں خانقاہوں میں بزرگوں پر روحانیت طاری ہے اور ہر طرف ""اللہ ھو' کی دعائیں بلند ہو رہی ہیں۔ اس طرح ناول صوفیانہ رنگ کے ساتھ داستانوی انداز میں آگے بڑھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ عصر حاضر کی تلخ سچائیاں بھی سامنے آتی رہتی ہیں، جس سے مسلمانوں کے موجودہ حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس ناول میں دکن کی نظام شاہی حکومت کے زوال کے حالات کے ساتھ ساتھ، جاگیرداروں، زمینداروں اور رئیسوں کا تذکرہ بھی ہے اس عہد کے ہندو مسلم بھائی چارہ کا ذکر بھی ہے۔

ناول میں ملک میں تیزی پنپنے والی تعصبیت، سماجی، مذہبی تبدیلی جیسے حقائق کو پیش کرتے ہوئے جہاں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی سیاسی پستی، تہذیبی زوال اور زبوں حالی کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ وہیں دوسری جانب ماضی میں مسلمانوں کی تابناک تہذیب ان کے جاہ و جلال اور خوشحالی کو پیش کرتے ہوئے ان میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان عصری تلخیوں اور ماضی کی حسین یادوں کے درمیان نورالحسنین نے کئی ایک موقعوں پر

رومانٹک مناظر بھی دلکش انداز میں بیان کئے ہیں لیکن یہاں بھی انھوں نے سنجیدگی کو ملحوظ رکھا ہے۔اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"حسین ایک دم میری طرف پلٹے۔ہواؤں نے میری زلفوں کو بھی میرے چہرے پر بکھیر دیا تھا۔میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔وہ مسلسل میری طرف دیکھے جارہے تھے۔ہم دونوں کے درمیان خاموشی چھائی ہوئی تھی۔بس ہواؤں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی میں چند لمحوں تک تو اسی حالت میں رہی لیکن پھر حسین کی آنکھوں کی تاب لانا میرے لئے دشوار ہو گیا۔مجھے محسوس ہوا جیسے میرے پورے بدن میں خون کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔کانپتی آواز میں میری زبان سے نکلا۔"ایسا کیا دیکھ رہے ہو۔"۔" (تلک الایام۔ص۔10)

جہاں تک اسلوب کی بات ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ،اسلوب نہایت سیدھا سادہ ہے شکستہ زبان، برجستہ لہجے کا موزوں استعمال ہوا ہے۔ناول نگار نے عہد ماضی کے واقعات رقم کرنے کے لئے صحیفوں کے تجربوں پر مشتمل زبان کو استعمال کیا ہے۔مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نورالحسنین کو بیان پر دسترس حاصل ہے۔

ناول کا ہیرو ایک ادیب ہے جو اپنے ایک ادھورے ناول کی تکمیل میں لگا ہوا ہے ایک روز اسے خواب میں کوئی دوسری دنیا لے جاتا ہے جہاں اس کے بزرگوں کے متعلق دستاویزات، کاغذات، ڈائری خطوط وغیرہ اس کے دسترس میں آجاتے ہیں۔جس کے بعد وہ کھویا کھویا سا رہنے لگتا ہے خواب کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔گھر والے اس کی اس کیفیت سے پریشان ہیں اس کی بیوی یاسمین اسے ڈاکٹر کے پاس لی جاتی ہے۔ڈاکٹر حسن کو "شائزوفرونیا" مریض قرار دیتا ہے۔چونکہ ایسے مریض ہی خوابوں کو سچ ماننے پر بضد رہتے ہیں۔اس طرح یہ ناول خواب اور حقیقت کے پنڈولم میں جھولتا ہوا عجیب وغریب واقعات کو قاری کے سامنے لاتے رہتا ہے۔خواب اور حقیقت کی بحث کو ناول نگار نے کس دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے ملاحظہ کیجیے:

"یاسمین تمہارے جواب کے لئے میں نے کتاب 'مقدمہ ابن قلدون، کا مطالعہ کیا ہے۔جو خواب کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔اور اسے نبوت کا 46واں حصہ قرار دیتا ہے۔اب رہی بات کہ خواب کی حقیقت کیا ہے؟۔۔۔۔۔۔ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس ناطقہ اپنی روحانی شاٹ میں کسی کسی وقت کسی واقعہ کی تصویر کا مطالعہ کر لیتا ہے۔کیوں کہ وہ جب روحانی حالت میں ہوتا ہے تو اس میں بھی واقعات بالفعل موجود ہوتے ہیں اور دیگر روحانی ذاتوں کی طرح چھپ جاتے ہیں۔نفس ناطقہ کو روحانیت کا کمال اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ جسمانی مادوں اور بندی حواس سے تعلقات چھوڑ دیتا ہے۔یہ قطع تعلق اسے سونے کی حالت میں کچھ دیر کے لئے حاصل ہوتی ہے اس لئے وہ اس پر سعادت لمحے میں مستقبل کے چند واقعات کا علم حاصل کر لیتا ہے۔"(تلک الایام۔ص۔78)

یوں تو ناول ماضی کی وادیوں کی سیر کراتا ہے لیکن ناول نگار عصر حاضر کی بھی سماجی، سیاسی معاشی حالات سے ہمیں آگاہ کرتے رہتا ہے۔اور آسمانی دنیا کی سیر کرتے ہوئے اچانک عصر حاضر کی تلخ حقائق والی زمین پر وارد ہوجاتا ہے ان تلخیوں کو اس طرح الفاظ کی زبان عطا کرتا ہے۔

"اس نے میری طرف گھر کر دیکھا، "میں بھی کہتی ہوں یہ الیکشن پاٹل ہی جیتے گا۔ ہمارے شہر میں اکثریت جو ہندوؤں کی ہے۔"

"عقلمند اس الیکشن میں چار نیشنل پارٹیوں کے امیدوار لڑ رہے ہیں۔ پھر چار پانچ آزاد امیدوار ہیں، جن میں تین مسلمان ہیں۔ چار نیشنل پارٹیوں میں تین کے ووٹر طئے شدہ ہیں اب بھی ایک نیشنل پارٹی جو کانگریس ہے، مسلمان اس سے نالاں ہیں کہ اس نے ساٹھ برسوں میں بھی مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کیا۔ پھر بھی مسلمانوں کا ایک طبقہ اسے ووٹ دے گا۔ یہ جو تمہارے تین مسلمان کھڑے ہیں یہ خود نہیں کھڑے ہیں بلکہ کھڑے کئے گئے ہیں تا کہ مسلمانوں کے ووٹ تقسیم ہو کر وہ بے وقعت ہو جائیں اس پوزیشن میں تمہارے پاٹل صاحب کہاں دکھائی دیں گے؟ (تلک الایام۔ص۔102)

اس طرح کا ناول تخلیق کرنا نہایت جوکھم کا کام ہوتا ہے اور اختتام کے وقت کہیں کہیں جھول پڑھانے کا خدشہ زیادہ رہتا ہے لیکن نورالحسنین نے فنی چابکدستی سے کام لیتے ہوئے ناول کے اختتام کو وحدت تاثر کے پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ انھوں نے مرکزی کردار کی زبان سے ایک مکالمہ ادا کرواتے ہوئے ناول ختم کیا ہے جو ان کی مہارت و فنکارانا صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے۔

"۔۔۔۔۔۔ پتہ نہیں وہ کب تک اسی طرح بیٹھا رہا، پھر اس نے بیوی کو آواز دی۔ وہ جیسے ہی اس کے قریب پہنچی کچھ دیر تک اسے مایوس نظروں سے چھوڑتا رہا پھر اس کی گردن جھک گئی اور اس کی زبان سے نکلا۔ "یاسمیں تم سچ کہتی تھی میں واقعی شائزوفورنیا کا مریض ہوں۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔۔۔۔۔" (تلک الایام۔ص۔

خواہ مخواہ حیدرآبادی

مزاحیہ نظم

خواہ مخواہ جو ہر محفل کی جان تھا
ایک عرصہ ہوا بیوی کو پیارا ہو گیا
بیوی کو موت دے یا مجھے موت دے خدا
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اِس دعا کے بعد
عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار بال
دو آرزو میں جھڑ گئے دو انتظار میں
میرے گھر میں آسودگی اس لئے ہے
کوئی چیز ضرورت سے زیادہ نہیں ہے
بہتر ہے موت خواہ مخواہ، دیتی تو ہے کفن
گر زندگی کا بس چلے، کپڑے اُتار لے
محبت میں مرتے تو ہیں خواہ مخواہ سب
جنازہ کسی کا نہ دیکھا نکلتے ہوئے
معشوق ہو حسیں یہ ضروری نہیں، مگر
عاشق کو چاہئے کہ وہ اندھا ضرور ہو
خوامخواہ چھیڑتی رہتی ہیں رخساروں کہ
تو نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

بزم سخن اور ''گلدستۂ بزم سخن'' ایک تعارف

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

مبصر: **اسامہ ارشاد معروفی قاسمی**۔ پورہ معروف کرتھی جعفر پور، مئو (یوپی)

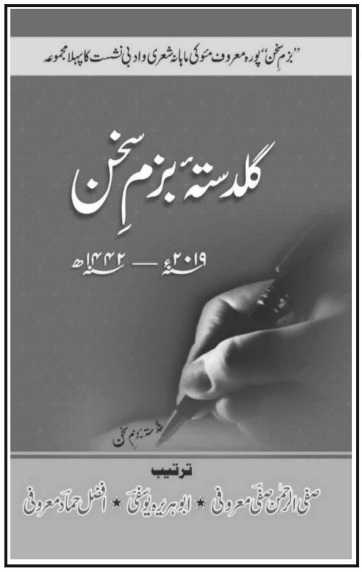

شعر و ادب کی دنیا گویا سمندر ہے، جہاں رنگ برنگے، چھوٹے بڑے سفینے بزموں اور انجمنوں کی شکل میں اپنی اپنی متعین کردہ سمتوں میں رواں دواں ہیں، اور اس کے ذریعہ ماہانہ شعری و ادبی نشستوں کا اہتمام کر کے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کیونکہ اردو زبان و ادب کی سرگرمیوں کو فعال رکھنے کے لیے شعری نشستوں کا انعقاد بے حد ضروری ہے جس کے ذریعہ ایک سنجیدہ اور پرسکون ماحول فراہم ہوتا ہے اور نئے شعرا و ادبا کو اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملتا ہے اور وہ ایک خاص تربیت کے ساتھ ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، اس طرح کی نشستوں کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ وہ شعرا اور ادبا جو گمنام مگر قابل قدر ہیں ان کو ان کا حق بھی دیا جاتا ہے۔ ''ٹیگور'' کا کلام اگر لندن کے ادبی حلقوں کی توجہ کا مرکز نہ بنتا اور شعری نشستوں میں اس کا ذکر مسلسل نہ ہوتا رہتا تو انھیں نوبل انعام شاید ہی ملتا۔

پورہ معروف میں ''بزم سخن'' کا قیام ایسے ہی خوبصورت اور رواں شعری و ادبی سفینے کی ایک کڑی ہے۔ جس کا قیام ۳۱؍جنوری ۲۰۱۹ء کو عمل میں آیا، اس کے زیر اہتمام ہر ماہ پابندی سے شعری و ادبی نشست منعقد ہوتی ہے، جس میں شاعری کے علاوہ ادبی مقالے بھی پیش کیے جاتے ہیں، الحمد للہ اس بزم نے بہت مختصر وقت میں قرب و جوار کے شعری و ادبی حلقوں میں اپنی خاص جگہ بنالی ہے، اس کامیابی کے پیچھے بزم کے مضبوط و معتبر اراکین اور گلوکار متشاعروں سے پاک خالص شعرا کی شرکت کے علاوہ باذوق سامعین کا بھی ہاتھ ہے، اس طرح کے حسین سنگم سے نہ صرف بزم کی افادیت اور مستحکم ہو جاتی ہے بلکہ شعرا اور سامعین دونوں کے لیے مفید بھی ثابت ہوتے ہیں۔

سعودی عربیہ میں مقیم ہونے کے باوجود سوشل میڈیا کے ذریعے میں اس بزم کی سرگرمیوں اور اس کی نشستوں میں پیش کیے جانے والے کلام اور مقالوں سے

محفوظ ہوتا رہا ہوں۔ اور وطن آنے کے بعد جتنے ماہ یہاں قیام رہا تقریباً سبھی نشستوں میں شرکت رہی اور مقالہ بھی پیش کرنے کا موقع ملا۔ الحمد للہ اس بزم کے قیام کے شروع ہی سے میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کے تمام اراکین ایک نئے جوش اور لگن کے ساتھ کام کرنے میں جُٹے ہوئے ہیں۔

مجھے بیحد خوشی ہو رہی ہے کہ بہت ہی کم وقت میں اس بزم کا یک سالہ مجموعہ ''گلدستۂ بزم سخن'' کے نام سے کتابی صورت میں منظر عام پر آیا ہے۔ یہ بھی اس بزم کی فعالیت اور اراکین کے متحرک ہونے کی دلیل ہے۔ اس کتاب کا مجموعی مطالعہ اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ بزم کی طرف سے جاری کردہ مصرعوں پر سبھی شعرا نے اپنے اپنے طور پر بہتر اور مثبت انداز میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور مقالہ نگاروں نے بھی اہم موضوعات پر مقالے پیش کیے ہیں۔ اس کتاب میں بزم کے نائب صدر صفی الرحمٰن صفی معروفی نے بزم کے قیام اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ بزم کے سرپرست مولانا مسیح الدین نذیری، اسعد الاعظمی، مولانا نوشاد احمد قاسمی، مولانا انصار احمد معروفی، راقم الحروف اور کبیر الدین اعظمی کی تحریریں بھی بزموں اور نشستوں کے قیام کی افادیت اور اس مجموعہ کی اہمیت کو پُر زور انداز میں بیاں کر رہی ہیں۔ بزم کے صدر مولانا ابو سعد وصی معروفی نے اپنے پیش لفظ میں بزم کے تعارف کے ساتھ ساتھ پورہ معروف کے قدیم شعرا کا تعارف مع کلام تجزیاتی انداز میں پیش کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''گلدستۂ بزم سخن'' کے مرتبین میں صفی الرحمٰن صفی معروفی، ابو ہریرہ یوسفی اور افضل حماد معروفی ہیں۔ اس مجموعہ میں ۱۱ر نشستوں پر مشتمل کل ۳۳ر شعرا کے ۱۳۴ر کلام اور ۷ر مقالہ نگاروں کے ۸ر مقالات شامل ہیں۔ مجموعہ میں جن مصرعوں پر شعرا کے کلام شامل ہیں وہ اس طرح ہیں: ''مدح ممکن ہی نہیں ہے مصطفیٰ کے نام کی، بار غم و آلام اٹھایا نہیں جاتا، اب گفتگوئے کاکل و رخسار کیا کریں، منزل کا جو پتہ دے وہ رہبر ہمیں تو ہیں، حالات بدلتے ہی وہ مرضی سے ملا ہے، میں کس سے کہتا کوئی ہم زبان تھا ہی نہیں، ہے جدا سب سے مری جرأتِ گفتار کا رنگ، رقص کرتی ہے قیامت خیز وحشت ہر طرف، میرے پختہ عزم کے آگے یہ پتھر کچھ نہیں، آج رسوا میرا قاتل ہوگیا، رات کو جب میں سوتا ہوں تو سوتا ہوں انگاروں پر، ان کے علاوہ ایک غیر طرحی نشست کے کلام بھی شامل ہیں۔ اسی طرح جن شعرا کے کلام شامل ہیں ان میں ''مسیح الدین نذیری معروفی، کلیم معروفی، عبدالرؤف حافظ معروفی، شرف الدین بیکل بیضاپوری، ابو سعد وصی معروفی، صفی الرحمٰن صفی معروفی، ابو ہریرہ یوسفی معروفی، محمد افضل حماد معروفی، ڈاکٹر شیدا بیضاپوری، مطیع اللہ مسعود قاسمی معروفی، رشید الدین معروفی، اسلم صادق بیضاپوری، غفران احمد معروفی، محمد نعمان فاروقی معروفی، محمد ارشد معروفی، محمد طارق عمر معروفی، حذیفہ اسجدی معروفی، عبداللہ فاروق معروفی، ظفر الاسلام معروفی، شمیم حیدر شمیم معروفی، عظیم معروفی، جاوید قمر قاسم پوری، معصوم نجف جعفری معروفی، حسنین حیدر معروفی، اظہار عالم فائق بیضاپوری، کبیر الدین اعظمی، محمد عبدان عابد کوپاگنج، شمیم صادق مئوی، ڈاکٹر عبدالحنان رہبر مبارک پوری، حماد احمد

مئوی، منظر جمیل عاشق مئو، ماسٹر ابوطلحہ مبارک پوری، اور یعقوب فلک مئوی ہیں۔ اور مقالوں میں ان کے عناوین مع مقالہ نگار اس طرح ہیں: ''ہمارے معاشرے کے مشاعرے'' (ابوہریرہ یوسفی) ''عصری علوم سے دوری کے اسباب و عوامل'' (شمیم مشتاق معروفی) ''شعرو شاعری'' (کبیر الدین اعظمی) ''وہ کون سا ہے کام جو انساں نہ کر سکے'' (محمد حمزہ معروفی) ''اُردو صحافت کا ماضی، حال اور مستقبل'' (ابوہریرہ یوسفی معروفی) ''مولانا امانت اللہ صاحبؒ کے مطالعہ کی کیفیت'' (مولانا صفی اللہ معروفی) ''عمل سے زندگی بنتی ہے'' (محمد ریحان معروفی) ''علماء کے تئیں عوام کی ذمہ داری'' (عبداللہ فضل معروفی)۔ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد بیان کرتے ہوئے ''عرض مرتب'' میں صفی الرحمٰن صفی معروفی لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کے شائع کرنے کا ایک اہم مقصد یہ بھی پیش نظر تھا کی باذوق سامعین اور شعرا بشری کمزوری کی وجہ سے دیگر شعرا کا کلام سننے کے بعد دوسرے دن بھول جاتے ہیں۔ اور جب تخلیقات کو کتابی صورت میں جمع کردیا جائے گا تو ان کے پسندیدہ کلام ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رہیں گے اور رہتی دنیا تک شاعر اور اس کی تخلیقات محفوظ ہو جائیں گی۔ اور تخلیق کار ہمیشہ ان اوراق میں زندہ رہے گا اور لوگ اس سے استفادہ کریں گے اور ادب

یاسین ہابیلؔ ۔حیدرآباد

اقرارِ بشر

بے سبب تیری ہنسی اچھی نہیں
دل جلوں سے دل لگی اچھی نہیں

بھائی کا قاتل خود اس کا بھائی ہے
جان لیوا برادری اچھی نہیں

کچھ جوانی کے تقاضے بھی تو ہیں
اس قدر سنجیدگی اچھی نہیں

ساقیا دست کرم سے جام دے
اور اب یہ تشنگی اچھی نہیں

جو نہ دیتے نہ ہی کچھ لیتے ہیں
آپ کی یہ بندگی اچھی نہیں

بے حجابی فیصلہ منصف کا ہے
کچھ بھی ہو بے پردگی اچھی نہیں

آستین میں جس کے خنجر ہو چھپا
ہابیلؔ اس سے دوستی اچھی نہیں

تخلیق کرنے والوں کو یاد رکھا جائے گا۔'' (صفحہ ۸)

اس مجموعہ کی اشاعت پر میں بزم کے تمام اراکین اور بہ طور خاص اس کے مرتبین صفی الرحمٰن صفی معروفی، ابوہریرہ یوسفی قاسمی اور افضل حماد معروفی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ مجموعہ شعری و ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کرے گا۔ کتاب ۲۰۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت: ۳۰۰ روپیے ہے۔ اشاعت: ۲۰۲۱ء۔ ناشر: بزم سخن پورہ معروف کرتھی جعفر پور مئو ناتھ بھنجن، یوپی۔ رابطہ: 9807670374, 8960266795, 9198568565

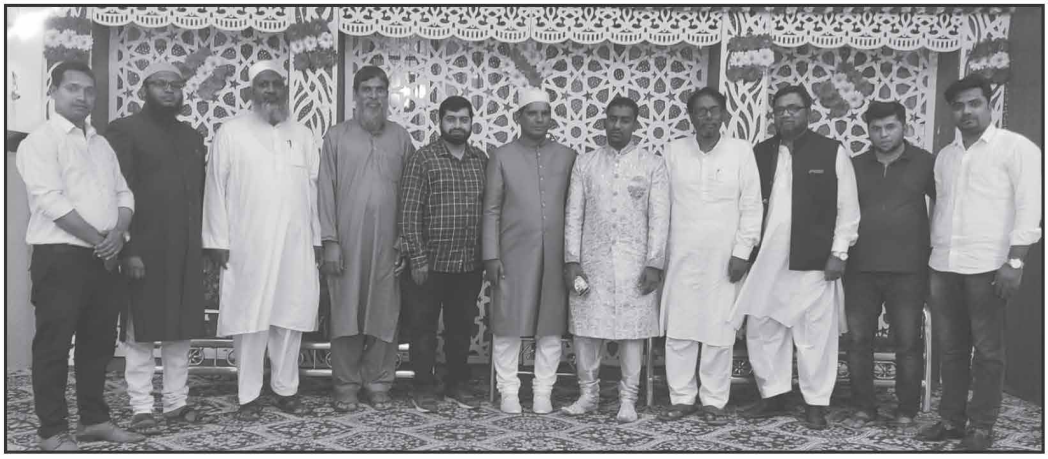

محسن خان کے عقد کے موقع پر ڈاکٹر سید حبیب امام قادری، محترم عبدالمجید ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر محمد آصف علی، محترم محمد اصغر، ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی ایڈیٹر ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد اور دیگر مبارک باد پیش کرتے ہوئے

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر

UNANI CENTER FOR CARDIAC

Consultation Time
Morning: 9:00 am to 2:00 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

MADRASA ISLAMIA NAJMUL ULOOM
Shahi Hills, Near Masjid Noor Ali, Shaheen Nagar, Hyderabad.
SHIBLI INTERNATIONAL
EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST

Madrasa Islamia Naimul Uloom
مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم
SIECT
Regd. No. 180/2016

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم
شاہی ہلز نزد مسجد نور علی، شاہین نگر، حیدرآباد
Regd No: 180/2016

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.....گرامی قدر محترم! امید ہے کہ آپ اپنے متعلقین کے ساتھ بخیر وعافیت ہوں گے

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے خَیْرُکُم مَن تَعَلَّم القُرآن وَعَلَّمَہ ۔تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی علم کی نشر واشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد میں ۱۵؍جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تا کہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہوجائیں۔اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔ٹرسٹیوں کے مشورے سے ٹرسٹ اور مدرسہ کے لیے تین سو ستائیس (327) رگز زمین شاہی ہلز شاہین نگر میں خریدی جاچکی ہے،جس کی مجموعی قیمت چھتیس لاکھ ستّر ہزار تھی۔الحمدللہ اہل خیر کے تعاون سے بیشتر رقم ادا کردی گئی ہے۔ماشاءاللہ تعمیری کام جاری ہے۔الحمدللہ پہلا چھت پڑچکا ہے،مزید مراحل کے لیے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ نقد اور اشیاء سے تعاون فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔نوازش ہوگی۔

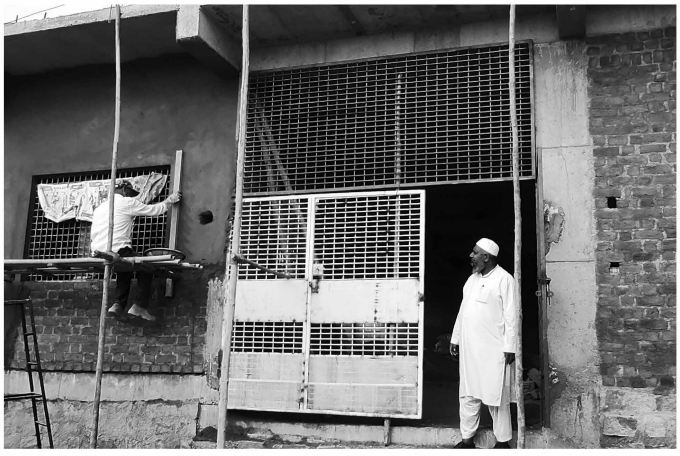

Bank Name: IDBI CURRENT ACCOUNT
A/c Number: 1327104000065876
A/c Name: SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFSC Code: IBKL0001327. Branch: Charminar

حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Google Pay: **8317692718** WhatsApp: **9392533661**

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad

June 2022 جون

RNI: TELURD/2018/77022
ISSN: 2581-9216

Rs. 20/-

ABDUL WAHED
PROPRIETOR
Cell: 98480 36940

For Orders : 90302 02018
86396 32178
89197 03547

KGN
TEA SALES

WHOLESALE & RETAIL TEA MERCHANT

S.No.: 22-1-114, Jambagh, Kali Khabar Main Road, Dar-ul-shifa, Hyderabad - 500 024, TS
Off.: 5-3-989, 104, First Floor, Sherza Estates, N.S. Road, M.J. Market, Hyderabad - 500 095
email: kgnteasales@gmail.com

Editor, Printer, Published & Owned by Mohd. Muhamid Hilal
Printed at Daira Electric Press, #22-8-143, Chatta Bazar, Hyderabad. 500 002.
Published at #17-3-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex, Dabeerpura, Hyderabad - 23, T.S
Cell: 9392533661, 8317692718, Email: muhamidhilal@gmail.com